Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1960ء

There is a special feature of the Islamic State which must not be overlooked. There, obedience is due to God which takes practical shape in the observance of the Quranic principles and commands. In Islam, obedience is due neither to a king, nor to a parliament, nor to any individual organisation. It is the Quranic provisions which determine the principles of our freedom and discipline in political and social spheres. In other words, Islamic State is an agency for enforcing Quranic principles and injunctions.

(Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah)

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے اصول اور احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

(قائد اعظم محمد علی جناحؒ)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ ۸ روپے
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۳ | اگست سنہ ۱۹۶۰ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

لمعات		۲
حدیثِ شوق	(محترم ابوالمعاکف صاحب)	۹
(پرویز صاحب کا کراچی کا دورہ)		
معرکۂ دین و وطن	(علامہ اقبالؒ)	۲۹
سرسید احمد خانؒ	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۱
اسلام اور تعلیم	(محترم چوہدری افتخار احمد صاحب)	۵۷
تقد و نظر	(قادیانیت مطالعہ و جائزہ)	۶۳
بھول بھلیاں	(محترم میر ولی الدین صاحب)	۷۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۳ر جولائی کو ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک ریسرچ) کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے محترم صدرِ مملکت نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں کچھ نکات ایسے ہیں جو اسلام کے حسین و تابناک چہرے پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانے میں کافی حد تک ممد و مددگار ہو سکتے ہیں۔ مقامِ تاسف و حیرت ہے کہ اس خطبہ کا پورا متن (ہماری معلومات کے مطابق) کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا حالانکہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی تھی کہ اس کی عام اشاعت ہوتی۔ وہ نکات جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے مذکورہ بالا اجلاس کی روئداد کے سلسلہ میں اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ صدرِ مملکت نے اس سلسلہ میں فرمایا،

> اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا نفاذ کیا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی اُلجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کون سی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جس کے متعلق طلوعِ اسلام گذشتہ بارہ سال سے مسلسل و متواتر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں

(۱) ایک طرف مغرب زدہ ذہنیت کا حامل گروہ ہے جس کے نزدیک انسانی معاشرہ میں کوئی چیز غیر متبدل نہیں۔ ایک قوم اپنے وقتی مصالح کے پیشِ نظر جو فیصلہ کرے وہی حق ہے۔ اسے سیکولر انداز حکومت کہتے ہیں۔

(۲) دوسری طرف ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ہے جس کے نزدیک اسلامی معاشرہ میں کوئی شے قابلِ تغیر و تبدل نہیں۔ جو فیصلے اسلاف نے دے رکھے ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ انہیں من و عن نافذ کرنے کا نام اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

ان دونوں کے بین بین قرآن کی تعلیم ہے وہ کہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ، تبدل اور غیر تبدل کے امتزاج سے

عبارت ہے۔ غیر متبدل خدا کی طرف سے عطا کردہ الدین ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ الدین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانہ کی امت مسلمہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے قوانین و احکام مرتب کرتی ہے۔ ان میں عند الضرورت تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مروجہ مذہب میں بدقسمتی سے متبدل اور غیر متبدل عناصر باہم گڈمڈ مخلوط ہو چکے ہیں اور بہ تقاضائے قدامت پرستی، اس پورے مجموعہ کو غیر متبدل سمجھ لیا گیا ہے۔ اب جبکہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کے لئے کوشش ہو رہی ہے، سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ متبدل اور غیر متبدل عناصر کو الگ الگ کر دیا جائے۔ اس میں ہمارے لئے کوئی دشواری نہیں۔ خدا کی کتاب (قرآن کریم) ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس کے اصول و احکام غیر متبدل ہیں۔ جو اس کے باہر ہے وہ اپنے اپنے زمانہ میں دین پر عمل پیرا ہونے کی تعبیر ہے۔ اس میں جو باتیں ایسی ہیں جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں انہیں علی حالہ رکھا جائیگا۔ جن میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے ان میں ضروری تبدیلیاں کر لی جائیں گی جو نئے امور سامنے آئیں گے ان کے لئے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے نئے قوانین مرتب کر لئے جائیں گے۔ ہمارے زمانے میں اسلامی نظام کے احیاء و قیام کی یہی صورت قابل عمل اور قرآنی تعلیم کے مطابق ہے اور مقام مسرت ہے کہ محترم صدر مملکت کو اس کا احساس ہے۔

(۲) اسی سلسلہ میں صدر مملکت نے دوسری اہم بات یہ کہی کہ

> سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے کبھی کام نہ لیں) لیکن اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کرتا ہے اس میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ علم و بصیرت کی کسوٹی پر پورا اترے اور عقل و فکر کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ یہ تو قرآنی حقائق کا اعجاز ہے کہ وہ ہر زمانہ کے انسان کے علم و بصیرت اور دانش و تدبر کی امامت کرتے ہیں۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی ضد کا نتیجہ ہے کہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ، غیر محسوس طور پر، دہریت اور مادہ پرستی کے بھیانک غاروں کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے جن میں سب سے زیادہ خطرناک غار کمیونزم کا ہے۔ یہ طبقہ اپنی ضد پر اس لئے قائم ہے کہ اس سے اس کے معاش کا سوال وابستہ ہے۔ یہ وجہ تھی کہ طلوع اسلام نے مدتوں پہلے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت کو چاہیئے کہ اس طبقہ کی باعزت روٹی کا انتظام کرے اور دین کی تعلیم مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے۔ اس مسئلہ کا آج بھی یہی حل ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو، جیسا کہ صدر مملکت نے فرمایا ہے

> بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقل عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

(۳) جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے وہ تنہا ہماری آواز نہیں۔ اب ملک کے اہلِ فکر طبقہ نے بہ حیثیتِ مجموعی انہی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ موقر جریدہ پاکستان ٹائمز نے اپنی ۱۶ جولائی کی اشاعت میں صدرِ مملکت کے زیرِ نظر خطاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے جس کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

'اسلامک ریسرچ'

"گزشتہ بدھ کے روز، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے بورڈ آف گورنرز کے پہلے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے صدرِ مملکت محمد ایوب خان نے ان عناصر کا محققانہ تجزیہ کیا جو صدیوں سے اسلام کے ترقی پسندانہ اصولوں کا گلا گھونٹنے اور ان کی صورت مسخ کرنے کے لئے مصروفِ کار ہیں۔ اسلام کے یہ اصول فرقہ ورانہ شوروشغب اور ظلمت پسندانہ تعبیرات کے ملبے کے نیچے دب گئے ہیں اور اب (کم از کم اس برصغیر میں) اسلام نام رہ گیا ہے ان بے روح عقائد و رسومات کی بوسیدہ ہڈیوں کا جو موجودہ سائنٹیفک دور کے تقاضوں کا سامنا قطعاً نہیں کر سکتیں۔ جیسا کہ صدرِ مملکت نے فرمایا ہے سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب اس وقت ہوا تھا جب لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے فیصلے خود سوچ سمجھ کر نہ کریں۔ کتاب اللہ کی تعبیر کی اجارہ داری ایک جامد و متعصب طبقہ نے سنبھال لی اور یوں افرادِ امت کا خدا کے کلام سے براہِ راست رشتہ چھوٹ گیا۔ ایسا کہنے میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں کے زمانے سے لے کر اس وقت تک ہمارا قدامت پرست طبقہ، قوم کی ترقی کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر حائل چلا آرہا ہے اور مسلمانوں نے تعلیم، معاشرت اور سائنس کے میدان میں جو کچھ ترقی کی ہے وہ اس تاریکی پسند گروہ کی شدید مخالفت کے علی الرغم کی ہے۔ آج اگر مسلم عوام، زمانے کے دھاروں سے اس قدر بیگانہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی احکام ان کے سامنے کبھی معقول اور معتدل طریق سے پیش نہیں کئے گئے۔ اور قرآن کریم کے غیر متبدل اور بنیادی قوانین میں (جو ہر زمانہ میں صداقت کے علمبردار ہیں اور ان جزئی اور فقہی قوانین میں جنھیں بعد کے فقہاء نے مرتب کیا (اور جن کے متعلق خود ان کے مرتبین نے بھی حرفِ آخر ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تھا) فرق نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور تضادات پیدا ہو گئے بلکہ غیر مسلموں کے دل میں خود اسلام سے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ البتہ اس سے ان لوگوں کو کچھ مفاد ضرور حاصل ہو گئے جو اسلام کو ایک ترقی دشمن قوت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ صدرِ مملکت نے ۔۔۔ جو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سرپرستِ اعلیٰ بھی ہیں ۔۔۔ جس راہِ عمل کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے زندہ اور متحرک بنیادی اصولوں کو عام کیا جائے تاکہ زندگی کی وہ ملبند اقدار جو قرآن کریم میں متعین کی گئی ہیں، لوگوں کے سامنے آسکیں۔ یہی ایک طریق ہے جس سے لوگ اس حقیقت کا احساس کریں گے کہ قرآن کریم عصرِ حاضر میں ترقی کا دشمن نہیں بلکہ اس نے ایسا پروگرام دیا ہے ۔۔۔ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ نوعِ انسان کے لئے ۔۔۔ جو فکر و عمل کے میدانوں میں انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے اور جس میں اس امر کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں پر پورا اتر سکے۔"

ہم اپنے موقر معاصر کو اس حقیقت پسندانہ تبصرہ پر دل سے تبریک پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دن ہم نے یہ اعلان کیا

کہ قرآن کریم ہماری آزادی اور پابندی کی غیر متبدل حدود متعین کرتا ہے۔ وہ دن نہ صرف ہماری نشاۃ ثانیہ بلکہ نوع انسان کی "تخلیقِ جدید" کی مبارک و مسعود ساعت ہوگی۔

---

(۲)

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وحی کی واضح تعلیم آجانے کے بعد لوگوں میں جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وحی کی تعلیم (معاذ اللہ) ان اختلافات کے مٹانے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ لوگوں کی باہمی ضد اور سرکشی (بغیاً بینھم) ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے نت نئے دن پیش ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال ملاحظہ ہو۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قوم میں اتحاد اور اتفاق اور وحدت و یگانگت بہت اچھی چیز ہے اور اختلاف اور تفرقہ تباہ کن نتائج کا موجب۔ تو ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایک متنفس بھی۔ بقائمی ہوش و حواس اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن کریم وحدتِ امت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ باہمی اختلاف، تنازع، تفرقہ، تشتت تحزب، تشیع و فرقہ بندی۔ پارٹی بازی) کو خدا کا عذاب اور مسلمانوں کی تباہی کا موجب قرار دیتا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ کوئی باہوش مسلمان اس سے انکار نہیں کرے گا۔

طلوع اسلام نے یہی کچھ کہا اور آپ حیران ہوں گے کہ ہمارا مذہبی طبقہ اس کی مخالفت میں خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اتر آیا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ

(۱) اتحاد۔ اتفاق۔ وحدت ملت۔ یگانگتِ امت۔ خدا کا عذاب ہے۔ اور

(۲) اختلاف۔ تنازعہ۔ تفرقہ انگیزی۔ پارٹی بازی اللہ کی رحمت اور اسلام کی صحیح تعلیم ہے۔

یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ طلوع اسلام کی بہرحال مخالفت کرنی ہے۔ اگر یہ کہے کہ خدا ایک ہے تو ان حضرات نے ثابت کر دینا ہے کہ خدا ایک نہیں ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں الاعتصام (لاہور) نے مولانا محمد حنیف ندوی صاحب کے قلم سے ایک سلسلۂ مضامین شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس کی پہلی قسط ۲۲ جولائی کے پرچہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے وجود سے بحث کی گئی ہے اور دعوہ کیا گیا ہے کہ مذہبی فرقوں کے متعلق آئندہ قسط میں لکھا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ قسط ہمارے سامنے اس وقت آئے گی جب طلوع اسلام کا اگست کا پرچہ پریس میں جا چکا ہوگا۔ اسلئے ہم اشاعت حاضرہ میں اس کا جائزہ نہیں لے سکیں گے۔

مضمون کی ابتداء اللہ کے نام کی بجائے حسب معمول گالیوں سے ہوئی ہے۔ ہم ان سے گزرتے ہوئے اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔ مضمون میں سیاسی پارٹیوں کو ختم کر کے وحدت امت کے خلاف ایک ہی دلیل پیش کی گئی ہے اور

وہ یہ کہ اس سے اختلافِ رائے کا حق ختم ہو جائے گا۔ اور ملک میں آمریت، فسطائیت اور اشتراکیت کا استبدادی نظام قائم ہو جائے گا۔ ارشاد ہے۔

> یہ بات پرویز صاحب سے پوچھنے کی نہیں۔ نہ اس سلسلہ میں ان کے فتویٰ کی کوئی حیثیت ہے۔ اسکو کالج کے کسی برخوردار سے پوچھ لینا کافی ہے جس نے سیاسیات کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہو کہ جس نظام حکومت میں اختلاف رائے کو جرم قرار دیا جائے وہ کسی درجے میں بھی صدارتی نظام کہلائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے؟ کیا ایسا نظام آخر میں بالکل وہی شکل اختیار نہیں کرے گا جس نے اٹلی اور جرمنی میں وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیا تھا جس پر خود ان ملکوں میں ندامت کا اظہار کیا جا رہا ہے؟

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> یہ حضرت تشریعات میں تو مشورہ کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں ہر اس بات کو دینی مان لیا جائے جو قرآنی معاشرہ میں باہمی مشورے سے طے ہو۔ مگر اسی معاشرہ کو یہ سیاسی اور انسانی حق دینے کو تیار نہیں کہ یہ نیک نیتی سے اختلافِ رائے کا اظہار کر سکے۔ یا حقیقی اور مخلصانہ اختلاف کی بنیاد پر کوئی اپوزیشن قائم کر سکے۔

خلافتِ راشدہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> یہ صحیح ہے کہ خلافتِ راشدہ میں کوئی باقاعدہ اپوزیشن نہیں تھی۔ مگر اختلافِ رائے اور اس کے احترام و توقیر کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ محترم ندوی صاحب یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ

(۱) اگر ملک میں سیاسی پارٹیاں نہ رہیں تو کسی کو اختلافِ رائے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔

(۲) ملک میں جمہوریت کی بجائے آمریت۔ فسطائیت۔ اشتراکیت کا مستبدانہ نظام قائم ہو جائے گا۔

یہ دونوں نتائج غلط ہیں۔ اختلافِ رائے کا حق صرف پارٹیوں کی موجودگی میں ہی باقی نہیں رہتا۔ پارٹیوں کے بغیر بھی یہ حق باقی اور قائم رہتا ہے۔ ذرا تصور میں لائیے ایسے ایوانِ پارلیمنٹ (مجلس قانون ساز) کو جس میں کوئی پارٹی نہ ہو اور ہر شخص انفرادی طور پر مسئلہ زیرِ نظر پر غور و فکر کرنے کے لئے آزاد اور اظہار رائے کے لئے مختار ہو۔ اس میں ایک مسودہ قانون پیش ہوتا ہے۔ ایوان کا ہر ممبر اپنی صوابدید کے مطابق اس پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ پھر رائے شماری کے وقت ہر ممبر آزادانہ رائے دیتا ہے۔ کثرتِ رائے سے مسئلہ زیرِ بحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

آپ فرمائیے کہ اس طریقِ کار میں کونسی چیز آمریت۔ فسطائیت۔ اشتراکیت کے استبداد کی ہے؟ کیا اس میں اختلافِ رائے کا حق سلب کر لیا گیا ہے؟ کیا اس میں افراد کی آزادیٔ خیال کو استبداد کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے؟ کیا اس میں جور و اکراہ کا کوئی شائبہ تک بھی ہے؟

یا مثلاً ملک میں عام انتخابات ہوتے ہیں۔ ہر شخص آزادی سے بطور امیدوار کھڑا ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو آزادانہ طور پر ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس طریق انتخاب میں (پارٹیوں کی عدم موجودگی سے) کون سے استبداد، آمریت اور مطلق العنانیت کی شکل پیدا ہو جائے گی جسے روکنے کے لئے پارٹیوں کو وجود میں لانا ضروری ہوگا؟

اس کے برعکس، پارٹی کا ممبر ہوتے ہوئے، فرد کی آزادی کس طرح سلب ہوتی ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ انگلستان، پارٹی سسٹم کی بنیادوں پر جمہوری نظامِ حکومت کا منجھا ہوا ملک ہے۔ پچھلے دنوں وہاں کی پارلیمان میں ایک مسودہ اس مقصد کے لئے پیش ہوا کہ اعدام کو قانوناً جائز قرار دیدیا جائے۔ چونکہ معاملہ بڑا اہم تھا اس لئے

اجازت دی گئی کہ اراکین، پارٹی کے طے کردہ فیصلوں کے بجائے اپنی اپنی ضمیر کے مطابق رائے دیں۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۲۰ جولائی)

آپ نے غور کیا کہ پارٹی میں اراکین کی آزادئ رائے کس طرح سلب ہوتی ہے۔ وہ اپنی ضمیر کے مطابق رائے دے ہی نہیں سکتے۔ انھیں پارٹی کے فیصلوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ خواہ وہ ان کے ضمیر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ان تصریحات کے پیش نظر آپ غور فرمائیے کہ ہمارے مذہبی پیشواؤں کے نزدیک

(۱) جس نظام میں امت کی وحدت قائم ہے اور ہر فرد کو حق حاصل ہو کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق آزادانہ اظہار خیال اور اختلاف کر سکے وہ نظام خلافِ اسلام ہو، اور

(۲) جس نظام میں امت کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور افراد کو اس کی آزادی نہ ہو کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق رائے دے سکیں، وہ نظام عین اسلامی!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئیے!

باقی رہا حکومت پر تنقید کا حق۔ سو جو لوگ قرآن کریم کے اس حکم پر ایمان رکھتے ہوں کہ

تعاونوا علی البر والتقوی۔ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (۵/۲)

بر و تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اور اثم و عدوان کے امور میں ایک دوسرے کی مدد مت کرو۔

اور جن کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا گیا ہو، ان کے حقِ تنقید کو کونسی اسلامی مملکت چھین سکتی ہے! لیکن یہ تنقید صرف غلط کاموں پر ہوگی۔ پارٹی سسٹم کی طرح یہ نہیں ہوگا کہ اپوزیشن کا فریضہ یہ قرار پا جائے کہ اس نے برسر اقتدار پارٹی کے ہر اقدام کی مخالفت کرنی ہے — اور مقصد اس مخالفت سے فقط یہ کہ حکومت اُس پارٹی کے ہاتھوں سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آجائے! قرآن کریم، امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم کرکے، انھیں آپس میں لڑانا نہیں چاہتا۔ وہ ساری امت کو ایک پارٹی (بنیان مرصوص) بنا کر، باطل کی قوتوں کے خلاف چٹان کی طرح مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

سستی اور معیاری کتابیں

میٹھے بول میں جادو ہے

یہ کتاب دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہے اور اس کی پچاس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب ڈیل کارنیگی کی مشہور زمانہ تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔

صفحات ۵۰۲ قیمت۔ تین روپے

پریشان ہونا چھوڑیئے جینا شروع کیجئے

محنت یا کام کی زیادتی سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے پریشانیوں کے ہاتھوں آئے دن ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے آپ ایسے طریقے جان لیں گے جن سے آپ کو جسمانی اور ذہنی سکون و راحت میسر آنے لگے گی۔

صفحات ۴۵۶ قیمت تین روپے۔

غبار خاطر

مولانا ابوالکلام آزاد کی قلعہ احمد نگر کی اسیری، ۹ اگست سنہ ۴۲ء تا ۱۵ جون سنہ ۴۵ء کے زمانے کی بعض تحریرات

یہ کتاب مولانا کی ذہنی زندگی کا سب سے روشن عکس ہے۔ بڑا سائز۔ ۳۰۰ صفحات۔ قیمت۔ تین روپے

تذکرہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان کے بعض اکابر و شیوخ کے سوانح و حالات۔ مرتبہ فضل الدین احمد مرزا

بڑا سائز ۳۰۰ سو صفحات قیمت تین روپے

سلیم کے نام (جلد سوم)

وقت کے عظیم مفکر حضرت علامہ پرویز کی تصنیف سلیم کے نام جلد اول اور دوم آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں جلد سوم بھی پرویز صاحب کی معرکتہ الآراء کتاب ہے۔ صفحات قریباً ۴۰۰۔ قیمت چھ روپے

فجر الاسلام

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی مشہور کتاب فجر الاسلام کا اردو ترجمہ

صفحات ۸۵۶ قیمت آٹھ روپے

پیارے نبیؐ کی پیاری زبان

قرآن مجید عربی زبان میں اتارا گیا ہے اسے براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھنا ہوگی۔ عربی زبان آسان طریقے سے سکھانے کیلئے پیاری زبان کا سلسلہ نہایت مفید ہے یہ سلسلہ چھوٹے چھوٹے ۲۴ حصوں پر مشتمل ہے جن سے مکمل طور پر عربی زبان آجاتی ہے۔ تیرہ حصے شائع ہو چکے ہیں ہر حصہ کی قیمت آٹھ آنے ہے اب تک شائع شدہ حصوں کی قیمت چھ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ طلوع اسلام** ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ **لاہور**

حدیثِ شوق

حدیثِ شوق نہ چنداں کہ در بیاں گنجد
اگر نہ جملہ تواں آنچہ می تواں برساں

جنابِ پرویز کے دورۂ کراچی سے متعلق رپورتاژ

★ ——————— از۔ ابوالعاکف

ابھی ۱۰ جولائی بہت دور تھی ——— یہ بات میں نے پیمانۂ امروز و فردا کے مطابق کہی ہے، ورنہ یہ تاریخ تو کتنے ہی دن پہلے ذہن میں اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی، احباب اور دین و دانش کے کتنے ہی طالب علموں کے اصرار پر پرویز صاحب نے یہ خبر بھیج دی تھی کہ وہ دس جولائی کو آ رہے ہیں..... ویسے وہ ذہنی طور پر ہم سے دور کب ہیں؟ ہر اتوار سندھ اسمبلی ہال میں اُن کی آشنا، نرم اور مستحکم آواز کے ذریعہ اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ایسی آواز تو پوری شخصیت ہوتی ہے۔

پہلی جولائی سے قرآنی ساتھی ہر صبح ۳۰۔ موہن داس بلڈنگ پہنچ جاتے۔ یہ کمرہ جواب انور کمرشیل کارپوریشن کا دفتر نہ رہا تھا بلکہ دفترِ استقبالیہ بن گیا تھا۔ اب کسی کو نہ اپنا کاروبار عزیز تھا اور نہ کوئی دوسری مصروفیت دامن کھینچتی تھی۔ یہ پرویز صاحب کے استقبال کی تیاریاں نہ تھیں بلکہ دل و جان پر صرف ایک خیال محیط تھا اور وہ یہ کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے باشعور لوگوں تک قرآنِ کریم کا پیغام کیسے پہنچایا جائے۔ ہر لمحہ یہی بحث رہتی کہ پہلا جلسہ کہاں ہو؟ دعوت نامے کسے کسے بھیجے جائیں؟ ہر شخص اپنی بات کہتا۔ کوئی نرمی سے۔ کوئی بلند آہنگی سے۔ لیکن جیسے ہی سب سے معقول تجویز سامنے آتی ہر ایک یوں خوش ہو جاتا جیسے اسی کی بات مان لی گئی ہو ——— "مشاورت" کا اسلامی تصور اس کے سوا اور کیا ہے؟

ذمہ داری تو مشترک تھی لیکن اس کا بار شیخ محمد شفیع اور میاں عبدالخالق صاحب کے کندھوں پر تھا۔ ۸ جولائی کو لاہور سے ٹرنک کال آیا کہ شفیع کے چچا صاحب کا "دمِ واپسیں" ہے وہ اور انور فوراً آجائیں۔ یہ دونوں اسی دن لاہور کے لئے روانہ

ہو گئے۔ لیکن جس کشمکش اور پیچ و تاب کے ساتھ اس کی یاد کوئی دیکھنے اور جاننے والا کبھی نہ بھول سکے گا۔ شفیع صاحب کا رشتہ اپنے چچا کے ساتھ کتنا گہرا تھا۔ پرویز صاحب کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن وہ رشتہ ہے جو ہر رشتے سے گراں بہا اور عظیم ہے۔ قرآن اور مقصد کا رشتہ۔ چہرہ کا ہر نقش روحانی کرب کا گہوارہ تھا۔ کرب یہ کہ ہم اُس فضا اور اس ماحول میں شرکت سے محروم ہو گئے جس میں آیاتِ ربانی کے شعلوں کی ابدی روشنی نگاہ و قلب کو منور کرے گی۔

۱۰ جولائی

آخر دس جولائی آ گئی۔ کہنے کو محض ایک تاریخ۔ لیکن ہمارے لئے ایک ایسا افق جس پر ہماری تبلیغی جد و جہد کا چاند ایک سال کے بعد طلوع ہو رہا تھا۔

لاہور سے پی۔ آئی۔ اے کا جہاز کوئی چار بجے سہ پہر کو آتا ہے۔ احباب ڈھائی بجے مورٹن بلڈنگ میں جمع ہو گئے۔ خیال تھا کہ کچھ کاروں کا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن نہ ہو سکا۔ جب تین بجے تو کسی نے کہا "ٹیکسیوں کا بندوبست کرو"۔ حافظ برکت اللہ کے لبوں پر فوراً آیتِ قرآنی ابھری۔

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ آخر یہ بسیں کس لئے چلتی ہیں؟

ایک ہی بس میں اتفاق سے سب ساتھیوں کو جگہ مل گئی۔ کچھ بصد تکلف بیٹھ گئے، کچھ بصد خوشی کھڑے رہے۔ ٹاور سے ایرپورٹ تک کوئی گیارہ بارہ میل کا فاصلہ ــــ اور وقت تھا کہ اپنی روایتی تیزی اور بے نیازی کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ دل تھے کہ دھڑکے جا رہے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

آخر کوئی پونے چار بجے بس نے اسٹاپ گیٹ پر پہنچا دیا۔ ابھی ہوائی اڈہ تک کوئی پون میل کا سفر باقی تھا۔ کچھ احباب کو دو ایک خالی ٹیکسیوں میں جگہ مل گئی۔ کچھ بادِ صبا کی رفتار کو شرماتے ہوئے پیدل ہی چل پڑے۔ چار بجتے بجتے سب ہی ایرپورٹ کی گیلری میں پہنچ گئے۔ یہاں کتنے ہی اور آشنا چہرے نظر آئے۔ مگر جلد ہی نگاہیں فضائے بسیط میں گم ہو گئیں۔ آخر ایک نقطۂ موہوم واضح ہوتے ہوتے پی آئی اے کا طیارہ بن گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پرویز صاحب ہوائی اڈہ کے ہال میں تھے۔ قرآنی احباب ہی ان سے بے تابانہ ہاتھ ملا رہے تھے۔ خود پرویز صاحب بے تابی کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک سے تفصیلی گفتگو کا موقع تو نہ تھا، لیکن ایک ہی جملہ میں وہ ہر ایک سے ایسی بات کہہ دیتے جو صرف اُسی سے ہی کہی جا سکتی تھی۔ اس ہنگامہ میں ہر ذات کا احترام!

دوستوں کے حلقے میں گھرے ہوئے پرویز صاحب موٹر تک پہنچے۔ ساتھیوں کو ایرپورٹ تک پہنچنے میں جو زحمت ہوئی ہو گی اس کا انہیں شدت سے احساس تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا

"یہ قرآن کی محبت ہے جو آپ کو یوں کھینچ لائی ہے۔ آپ غیر متبدل اقدار کے پیرو ہیں۔

آپ کی یہ عقیدت پرویز کے لئے نہیں ہو سکتی۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جس نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق کلامِ ربانی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خدا ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے۔

رہا میں، تو غالب کے الفاظ میں

"ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے!"

پرویز صاحب ہمیشہ یوں ہی باتوں باتوں میں منزل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ کاروان کیف و مستی کے راہیوں کے لئے ایسے اشارے شاید ضروری بھی ہیں۔

واپس لوٹتے ہوئے نہ جانے مجھے شبلی کے یہ شعر کیسے یاد آ گئے اور میں ان کی لذتوں میں کھو گیا۔

رفت از شہر بہ آساں کہ بہاراں ز چمن
آمد آں گونہ کہ در باغ، صبا می آید
گوئیا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد
یا نگار یمنی سوئے سبا می آید
رفتنش گرچہ بکامِ دلِ احباب نہ بود
چوں بیاید، بہ مرادِ دلِ ما می آید

ان شعروں میں وہ کیفیت تھی جو پرویز صاحب کے کراچی سے لاہور جاتے وقت دل پر طاری ہوئی تھی اور واپسی کے لئے بھی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا کہ جس زمین میں ڈاکٹر سعید مرحوم اور سبحانی مرحوم محوِ خواب ہیں، اب اسی کے دامن نے ڈاکٹر حمید کو بھی چھپا لیا ہے۔ پرویز صاحب ایک اور داغ لے کر کراچی آ رہے ہیں۔ مگر افراد یونہی حلقۂ حدِ نظر سے دور نکل جاتے ہیں اور جہاں میں آدمی یوں ہی رواں رہتا ہے۔ یہ فطرت کا آئینِ مسلم ہے۔ اور شاید یہ زیادہ غم کی بات نہیں ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

۱۱ جولائی ۱۰ جولائی کی شام سے ۱۱ جولائی کی شام تک پرویز صاحب اپنے ملنے والوں سے ملتے رہے۔ آرام کی کمی، شفیع والوں کا لاہور جانا۔ دوستوں کے مسائل۔ پرویز صاحب کی آنکھوں میں بجھیں خمار شب بن کر جھلکتی رہیں لیکن آنکھوں میں اسی تبسم کی رو جیسے موجِ زندگی کہ رہی ہے۔

۱۱ جولائی کی رات کو سوا نو بجے درسِ قرآن کریم سے اس دورہ کا آغاز ہو رہا تھا۔ سندھ اسمبلی ہال، شہر کی سب سے معروف سڑک کے سب سے معروف حصہ میں واقع ہے لیکن خود غیر معروف سا ہے کیونکہ اس کے احوال و کوائف ایک ریسرچ کا موضوع ہیں۔ یہ عمارت عمرو عیار کی روایتی زنبیل ہے جس کے دامن میں سب کچھ ہے۔ ایک ہال، اسکول، کتب خانہ، سندھی ادبی

بورڈ، ادارہ ترقی معاشیات، کئی سرکاری دفاتر، عربی کالج، نجومیوں کا ادارہ وغیرہ۔ ہر شخص اس عمارت کو مختلف ناموں سے جانتا ہے۔ اسی ہال میں پہلا درس تھا۔ اتفاق سے اخباروں کے ذریعے اطلاع بھی نہ دی جا سکی۔ اور پھر رات کا وقت۔ کسی مشرقی شہر میں رات کا تصور ان لوگوں کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا جو کسی پرانے، آہستہ خرام شہر (جیسے لاہور) میں زندگی گذارتے ہیں۔ جہاں رات فرصت لیکر آتی ہے۔ دوستوں کی یاد لے کر آتی ہے۔ گجروں کی خوشبو لے کر آتی ہے۔ گل گشت کا پیام لیکر آتی ہے۔ کراچی میں پسینہ میں ڈوبی ہوئی رات یاد دلاتی ہے کہ جسم درد اور تھکن کی آماجگاہ ہے۔ ذہن ویران ہے، جیب خالی ہے اور گھر تک پہنچنے کے لئے ابھی کتنے ہی مرحلوں سے گذرنا ہے۔

لیکن ۱۷ر جولائی کی رات کو سندھ اسمبلی ہال کی ہر نشست پُر ہو چکی تھی۔ گرمی خاصی تھی۔ پنکھے چل رہے تھے لیکن پچھلی نشستیں اُن کی فیض رسانی سے محروم تھیں۔ دیواروں کا سہارا لئے ہوئے کتنے ہی طالبانِ راہ کھڑے ہوئے تھے اور کسی کو گرمی کا احساس نہ تھا۔ گرمی، طبعی حقیقت سہی مگر اس کا احساس ہمارے ذہن کے تابع ہے اور آج کسی ذہن میں قرآن کے حقائق کو سمجھنے کے سوا کوئی خیال نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اخباروں میں اطلاع نہ شائع ہو سکی، اچھا ہی ہوا ورنہ آنے والوں کو بٹھایا کہاں جاتا؟ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے سب سے بڑے شہر میں مسلمانوں کا ایسا کوئی ہال نہیں جہاں ہزار آدمی بھی بیٹھ سکیں۔

پرویز صاحب سوا نو بجے سے پہلے آ گئے۔ آج تو اسٹیج کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ فرشی نشست۔ گاؤ تکیہ۔ اس درجہ مشرقیت! مغربی اسٹیج کو مشرقی روایات کا آئینہ دار بنانا ملک سعید کا کارنامہ ہے جو انتظامی امور میں شاعری کا حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ میاں عبدالخالق نمائندہ بزم طلوع اسلام نے ایک مختصر سی تقریر کے ذریعہ پرویز صاحب کو خوش آمدید کہا۔ اور پھر پرویز صاحب نے "قومیت اور اسلام" کے موضوع پر درس کا آغاز کیا۔

پرویز کی تقریر کی کیفیتوں کا اندازہ شاید مومن کے اس مصرع سے ہو سکے کہ

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اور یہ شعلہ محض آواز کا نہ تھا۔ فکر کا تھا۔ اس فکر میں عہد حاضر کی ذہنی اور معاشرتی الجھنوں کا بھی تجزیہ بھی تھا اور اس شبنم کی آمیزش بھی جو دل کے ہر زخم کے لئے مرہم ہے اور جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔

درس کا پہلا حصہ تجزیاتی تھا۔ جناب پرویز نے مغرب کے تصور قومیت (NATINALISM) کا تجزیہ مغربی مفکرین کے آئینہ میں پیش کیا اور یہ بات واضح کر دی کہ مغرب خود اپنی تہذیب کے آذر کے اس تراشیدہ بُت سے کس درجہ نالاں ہے۔ یہ بُت جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

میں نے باموقع اشعار پڑھتے ہوئے اپنے دور میں صرف دو بزرگوں کو دیکھا ہے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد کو اور دوسرے جناب پرویز۔ پرویز صاحب شعر اس طرح اپنی تحریر اور تقریر میں لاتے ہیں کہ وہ تقریر اور فکر کی فضا کا حصہ بن جاتا ہے۔

پرویز صاحب نے قومیت کی "تنگنائے" کی حدبندیوں کو یوں واضح کیا کہ "فساد آدمیت" کا سبب نظروں کے سامنے آ گیا۔ یہی قومیت ہماری صدی کی دونوں بڑی جنگوں کی بنیادی وجہ ہے۔ اسی قومیت نے انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر ستم یہ کہ ہر قوم اپنی "قومیت" کی تعریف کرتی ہے اور دوسروں کی قومیت کو "جارحانہ اقدام" قرار دیتی ہے۔ جہاں نعرہ یہ ہو کہ MY COUNTRY RIGHT OR WRONG وہاں مستقل اقدار حیات کی پاسداری اور تحفظ کون کرے اور کس لئے؟

قومیت کے تجزیے کے بعد پرویز صاحب نے بتایا کہ مغرب آج کس طرح "بین الاقوامیت" کی تشکیل و تلاش میں سرگرداں ہے لیکن اس کے پاس اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اور بنیاد کے بغیر کوئی تصور حقیقت نہیں بن سکتا۔ "یہ بنیاد اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے وحیٔ الٰہی کی روشنی میں پیش کی تھی۔ اور اسی بنیاد پر سرور کائنات حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انسانی معاشرہ کی تشکیل فرمائی تھی جس میں حبش کا بلالؓ، فارس کا سلمانؓ، روم کا صہیبؓ اور ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ یہ سب یکساں عزت و تکریم کے حامل تھے"۔

پرویز صاحب نے دورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انقلابی تجربہ کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ "قریش مکہ اس انسانی مساوات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ بات کبھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ قریش کا ایک جلیل القدر فرزند اور ایک غلام یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ قریش کی مخالفت کا اصل راز یہی تھا۔ بات اگر بتوں کی پرستش چھوڑنے اور ایک خدا کی عبادت کی ہوتی تو شاید قریش اس درجہ اسلام کی مخالفت نہ کرتے۔ انسانی مساوات تو ان کے مفادات کے لئے صورِ قیامت سے کم نہ تھی"۔

"قرآن نے عالمگیر برادری کی بنیاد انسانی مساوات پر رکھی ہے۔ ہر فرزند آدم پیدائش کے اعتبار سے یکساں ہے۔ یہاں عزت و توقیر کی بنیاد تقویٰ اور کردار کے سوا کچھ اور نہیں۔ قبائل و شعوب امتیاز کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہیں"۔

اسی ضمن میں پرویز صاحب نے اسلام کے تصور قومیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "اسلام نے قومیت کی بنیاد وطن، نسل، رنگ، اور زبان پر نہیں رکھی بلکہ نظریۂ حیات پر رکھی ہے۔ انسانوں کو صرف دو گروہوں اور قوموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو ایمان لائے، جنھوں نے خدا کے دیئے ہوئے نظریۂ حیات کی پیروی اختیار کی، اور وہ جنھوں نے انکار کیا۔ یہ تقسیم بھی امٹ نہیں۔ لوگ خدا کے نظریۂ حیات کو تسلیم کرتے چلے جا رہے ہیں اور انسانیت ایک قوم بنتی جا رہی ہے"۔

پرویز صاحب نے اس نظریۂ قومیت کی تشریح کرتے ہوئے انبیائے کرام کی حیاتِ طیبہ کے ابواب یوں پیش کئے

کہ کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جس نے آنسوؤں سے وضو نہ کیا ہو۔ طوفانِ نوحؑ میں ایمان والوں کی کشتی ساحلِ مراد کی طرف سلامتی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ پسرِ نوحؑ موجوں سے دست و گریبان ہے۔ جلیل القدر پیغمبر حضرت نوحؑ بارگاہِ رب العزت میں فرماتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ کیا اسے کشتی میں جگہ دیدوں۔ جواب ملتا ہے۔ "یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے" باپ بیٹے کا رشتہ۔ اس سے قریب تر اور کون سا رشتہ ہوگا۔ لیکن یہ تمہارا اہل نہیں —— میاں بیوی کے رشتہ سے زیادہ نازک کوئی اور رشتہ نہیں لیکن حضرت لوطؑ اور اُن کی بیوی کے درمیان فکر و نظر کے بڑے فاصلے حائل تھے اور یہ رشتہ تارِ عنکبوت بن گیا۔ آذر اور اُن کے بیٹے ابراہیمؑ کے درمیان بیٹے اور باپ کا تعلق نظریاتی بنیاد پر ختم ہو گیا۔ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نظر ڈالئے۔ بلال حبشیؓ تو قوتِ بازوئے محمدؐ ہیں اور حضورؐ کے حقیقی چچا مخالفوں کے سرگروہ ہیں۔ ہزار دل اسلام محمد عربیؐ کی ذاتِ اقدس پر جن کے اصحاب کی زندگی اسی رنگ میں رنگ گئی۔ جنگِ بدر میں ایک طرف حضرت صدیق اکبرؓ ہیں اور دوسری طرف مخالفوں کی صف میں اُن کے بیٹے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ایک دن انھوں نے جناب ابوبکرؓ سے فرمایا کہ —— "اباجان! میدانِ بدر میں آپ کئی بار میرے تیر کی زد پر آئے لیکن میرا ہاتھ باپ کی محبت سے کانپ گیا"۔ باپؓ نے کہا۔ "خدا کی قسم اگر تم میری زد پر ہوتے تو میرا ہاتھ ہرگز نہ کانپتا"۔

ان دینی حقائق کی روشنی میں نظریۂ قومیت کو پیش کرنے کے بعد پرویز صاحب نے اُس تاریخی جدوجہد کی یاد دلائی جس کا ثمرہ پاکستان ہے اور جو حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی آخری جدوجہد تھی۔ جس کی خاطر اقبال نے اپنے بسترِ مرگ کو میدانِ کارزار بنا لیا —— اقبال کی آواز جب آخری بار گونجی تھی تو اس پیغام کے ساتھ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است؟
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اب گھڑی کی سوئی گیارہ کی سرحد کو عبور کر چکی تھی۔ درس ختم ہوا۔ ایک صاحب پہلی بار میرے بڑے اصرار پر درس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ "کہیئے! کیا حال ہے؟" کہنے لگے کہ بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق"۔

۱۳ر جولائی آج شام تھیوسوفیکل ہال میں "خاندانی منصوبہ بندی قرآن کریم کی روشنی میں" کے موضوع پر پرویز صاحب کی تقریر تھی۔ وقت ساڑھے پانچ بجے کا تھا لیکن وقت سے بہت پہلے ہال کی ہر نشست پُر ہو چکی تھی۔ ہال کے باہر کا کھلا برآمدہ سامعین سے اس قدر بھرا ہوا تھا جیسے ایک علیحدہ جلسہ گاہ ہو۔ اوپر کی گیلری بھی بھر چکی تھی۔ اور کتنے ہی حضرات کھڑے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے تقریر شروع ہوئی۔ اتنے مختلف قسم کے لوگوں کو شاید ہی میں نے کسی جلسہ میں یوں یکجا جمع دیکھا ہو۔ ڈاکٹر، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا، مسجدوں کے خطیب، "علمائے کرام" سابق جماعتِ اسلامی کے اراکین۔ ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو ضبطِ ولادت کو "قتلِ اولاد" کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اسٹیج پر بھی ایسے ہی لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو اس موضوع پر پرویز صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکروں کا انتظام بھی "معقول" نہ تھا۔ شاید منتظمین کو ایسے مجمع کی توقع نہ تھی۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر کے دوران یہ جلسہ قدیم داستانوں کے کسی "شہرِ مسحور" کی یاد دلا رہا تھا۔ جہاں ہر طرف خاموشی کا راج ہو۔ اور یہ سحر سامری نہ تھا اعجازِ قرآن تھا۔

موضوع بڑا نازک تھا، کیونکہ جنسیات پر اظہارِ خیال کو ہمارے معاشرے میں "شجرِ ممنوعہ" قرار دیا گیا ہے اور اس شجرِ ممنوعہ کے پھل صرف "باب النکاح" اور "باب غسل" کے پتھروں ہی سے توڑے جا سکتے ہیں۔ آج گفتگو اُس موضوع پر تھی جس کے متعلق کبھی اکبر نے کہا تھا۔

عاشقی قیدِ شریعت میں جو آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

اب یہ کثرتِ اولاد جلوہ کی جگہ عذاب بن گئی ہے۔

پرویز صاحب نے تقریر کی ابتدا میں اس موضوع کی دقتوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ اس ہفت خواں کو طے کر گئے۔ اندازِ بیان کا یہ سلیقہ، مطالعہ قرآن کے نہج کا بہترین ثبوت تھا۔ کتنے لوگ ہیں جو لذت کے احساس کے بغیر یا آنکھیں جھکائے بغیر جنس کے مسائل کو قرآن کریم کی روشنی میں یوں پیش کر سکیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں پرویز صاحب کا عالمانہ مقالہ، جو اس تقریر کی بنیاد تھا، جولائی سنہ ۶۰ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی لئے تقریر کی تفاصیل پیش کرنا ضروری نہیں۔

قرآنی نقطۂ نظر کو پیش کرنے سے پہلے پرویز صاحب نے اُن اعتراضات کے تار و پود کو بکھیر دیا جو ضبطِ ولادت کے خلاف عائد کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے حرام کاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ گویا ضبطِ ولادت تو جائز ہے مگر اس کے ذریعہ قابلِ اعتراض ہیں۔ یہ دلیل تو ویسی ہے کہ لوگ بلانکٹ سفر کرتے ہیں اس لئے ریلیں بند کر دی جائیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ قتلِ اولاد ہے۔ اس اعتراض کی سطحیت کو کئی دلیلوں اور پہلوؤں سے پرویز صاحب نے ثابت کر دیا۔ (۱) جو ہستی وجود میں نہ آئی ہو اُس کا قتل کیسے ممکن ہے۔ (۲) اگر کوئی شخص جوان ہونے کے بعد نکاح نہیں کرتا تو وہ بھی قتلِ اولاد کا مرتکب ہے۔ (۳) استقرارِ حمل کے بعد جنسی اختلاط بھی قتلِ اولاد ہے۔ (۴) اگر اجتماعی تحفظ یا دین کی حفاظت کے لئے نوجوانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دینا جائز ہے تو اجتماعی مصالح کی خاطر انہیں وجود میں نہ آنے دینا

کس طرح قتلِ اولاد ہے؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ضبطِ ولادت، اللہ کی رزاقیت پر ایمان رکھنے کے منافی ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں پرویز صاحب نے نظامِ ربوبیت کے وہ دلآویز خطوط پیش کئے، جنہیں دوبارہ عملی شکل میں دیکھنے کے لئے زمانہ تیرہ سو سال سے سرگرداں ہے۔ ان آیات (وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۚ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اور وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا) سے مفہوم ہی یہ ہے کہ مملکت کا معاشی نظام ایسا ہو کہ وہ خدا کی ذمہ داری یعنی ربوبیتِ عامہ کو قبول کرلے اور افرادِ مملکت کی ہر ضرورتِ زندگی کی تکمیل کو اپنا فرض سمجھے:

ضبطِ ولادت کے سلسلہ میں جس طریقِ کار کو پرویز صاحب نے پیش کیا وہ جھنجھوڑ دینے والا تھا۔ اس نسل کو جو جنسیت کے سیلاب میں ڈوب چکی ہے۔ اس میں نوجوان بھی شامل ہیں اور مذہبی رہنما بھی۔ نوجوان جنسی جراثیم کا شکار مغربی فلموں اور عریانی کے مظاہروں کے ذریعہ ہوئے ہیں اور مذہبی رہنما دین کے غلط تصور کی وجہ سے۔ "چار بیویوں کا مقصد انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ کوئی رات خالی نہ جائے۔ اور قرآن کہتا ہے کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ کھیتی کی تشبیہ غیر مبہم طور پر بتاتی ہے کہ بیویاں اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں۔ اور "جب چاہو" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عند الضرورت کھیتی میں فصل اگائی جاتی ہے، اسی طرح اولاد بھی عند الضرورت پیدا کی جائے۔ اس کے لئے آلات وادویات کی ضرورت نہیں بلکہ علاج ضبطِ خویش اور اعلیٰ مقاصد واقدارِ حیات (جن کا سرچشمہ قرآن ہے) کو اپنانا ہے۔"

طلوعِ اسلام کے شائع شدہ مقالے میں کمی یہ تھی کہ پرویز صاحب نے جو قرآنی علاج بتایا ہے وہ اس جنس زدہ نسل کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اور اس نسل کے بارے میں مقالہ خاموش تھا۔ تقریر میں پرویز صاحب نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ "ضبطِ خویش کو عملی حقیقت اسی وقت بنایا جاسکے گا جب نظامِ تعلیم قرآنی خطوط پر متشکل ہو اور یہ تصور (کھیتی اور عند الضرورت اولاد) ہمارے ایمان کا جزو بن جائے۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جنسی جذبات کو اُبھارنے والے ذرائع کا انسداد کیا جاسکے۔ عبوری دور میں ادویات اور ضبطِ ولادت کے مروجہ طریقوں سے کام لئے بغیر شاید یہ اجتماعی ضرورت پوری نہ ہوسکے۔"

تقریر کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ "عزل" کے بارے میں سوالات۔ یا پھر یہ سوال کہ "آپ ضبطِ ولادت کی حمایت اس لئے کررہے ہیں کہ حکومت اس کی پشت پناہ ہے۔" اس سوال کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انگریز دشمن محمد علی جناحؒ کو کتنے ہی لوگ آخر تک "انگریزوں کا آلہ کار" کہتے ہوئے ذرا نہ شرمائے۔ طلوعِ اسلام کے صفحات اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ پرویز نے ہر حکومت کے غیر قرآنی اقدام کی جرأت سے مخالفت کی ہے۔ اور تو اور تعلیمی

کمیشن کی رپورٹ کی منظوری کے بعد بھی پرویز اپنی اس تمنا اور آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ "کاش ہمارا نظام تعلیم قرآنی بنیادوں پر تشکیل ہو سکے۔" منفی ذہنیت رکھنے والے یہ حضرات اپنے برسراقتدار مسلمان بھائیوں سے اس درجہ بدگمان ہیں کہ وہ کوئی اسلامی کام کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ خود ساختہ صالحین کا یہ گروہ اپنے آپ کو اسلام کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے۔

۱۵ جولائی آج شام فریئر ہال صدر میں پرویز صاحب کی تقریر تھی۔ موضوع تھا۔ "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟" — یہ ایک ایسا سوال ہے جو پورے معاشرہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہر فرد کے دل کی چبھن بھی ہے۔ وہ کردار ہی تو تھا جس نے دور محمدیؐ اور عہد خلافت راشدہؓ میں تاریخ کے دھارے کو بدل دیا تھا جس سے عرب کے بدو تہذیب و تمدن کے لئے قوت محرکہ (INCENTIVE) بن گئے تھے۔ آج کے جلسہ میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت کے چہرے موضوع کی سنگینی سے مطابقت رکھتے تھے۔ میری نگاہوں نے جب یہ حقیقت مجھ پر واضح کی تو ایک لرزش تھی میرے سارے بدن پر چھا گئی۔ میں بے حد خوش تھا کہ ابھی ہماری قوم احساس زیاں سے محروم نہیں ہے۔ متاع کا لٹ جانا اتنی اہم بات نہیں جتنا احساس زیاں کا ختم ہو جانا ہے۔ ہماری قوم میں ابھی سوز آرزو باقی ہے۔

کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے

یہ کھٹک غم منزل بنتی جا رہی ہے۔ اور جس دن یہ قوم بیدار ہو گی، منزل قدموں تلے آ جائے گی۔

اس اہم تقریر کا ایک خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کیریکٹر نہ ہونے کے اسباب کا تجزیہ کرنے سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

ہم ہر دن اس قسم کی باتیں سنتے ہیں۔

(۱) "آجکل لوگ رشوت لئے بغیر کام ہی نہیں کرتے"؟
"صاحب! کیریکٹر نہیں ہے!"

(۲) "پہلے لوگ رشوت لے کر کام تو کر دیتے تھے۔ اب رشوت لے کر بھی نہیں کرتے"
"وہ پہلا سا کیریکٹر بھی نہیں رہا"۔

گویا کیریکٹر نہ ہونے سے ہماری مراد صرف وہی جذبات ہوتے ہیں جس سے ہمیں تکلیف پہنچی ہو۔ کیریکٹر کا یہ محدود تصور عام آدمیوں تک محدود نہیں بلکہ بڑے بڑے مفکرین اخلاقیات بھی کیریکٹر کی کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ ایک گورکھ دھندا بن گیا ہے کرسگارڈ کے خیال کے مطابق اخلاق کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر ایک ذہنی حقیقت ہے۔ یہ تعریف بادِ ہوائی ہے اور ہمیں کیریکٹر کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوئی بنیاد نہیں دیتی۔ وائیٹ ہیڈ (WHITE HEAD) جیسا مفکر بھی کیریکٹر کی کوئی واضح تعریف نہ کر سکا۔ اس کے نزدیک جب ظاہر (APPERANCE) حقیقت سے

ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں اور صداقت کردار کے اظہار کا نام ہے۔

آیئے مغربی مفکرین کو چھوڑ کر اپنی زبان کے ایک عام محاورہ کو لیں۔ کیونکہ محاورات معاشرہ کا آئینہ، سوسائٹی کے تصورات کا مرقع اور اسلاف کے تجربات و معتقدات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ وہ محاورہ یہ ہے ــــــ "مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو" کتنی خوبصورت اور اچھی بات ہے۔ تحفظ جان ہر جاندار کی خصوصیت ہے۔ یہ زندگی کی حیوانی سطح ہے لیکن آبرو کا تصور حیوانوں میں نہیں ہوتا۔ یہ شرف انسانیت کا تقاضہ ہے اور انسانی قدر ہے۔

یہاں تک تو بات صاف ہو گئی، لیکن سوال یہ ہے کہ انسانی قدر کیا ہوتی ہے؟ آبرو کہتے کسے ہیں؟ کیا یہ اضافی چیز ہے۔ جیسے مشرق اور مغرب میں عصمت کا تصور کس قدر جداگانہ ہے۔ اسی طرح ماں باپ کی عزت و تکریم کو ہمارے معاشرہ میں ایک قدر کا درجہ حاصل ہے اور بعض قبیلے ان کو کھا جاتے ہیں۔

اگر انسانی معاشرہ کی اقدار اضافی ہوں تو انسانیت کبھی کسی ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکے گی۔ یہ حقیقت ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ مستقل اقدارِ حیات وہی (خدا) دے سکتا ہے جو زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اور جو شخص اپنے جبلی تقاضوں پر مستقل اقدارِ حیات (جو قرآن میں محفوظ ہیں) کو ترجیح دیتا ہے وہی صاحب کردار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ
الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ
أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۔ (۴/۱۳۵)

ذرا کردار کے اس پہلو کو دیکھئے کہ آدمی اللہ کا گواہ بن جائے۔ مدعی اور مدعا علیہ نہیں۔ اور تو اور "وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ" چاہے گواہی خود تمہاری ذات کے خلاف کیوں نہ ہو۔ نہ جانے دنیا کے ادارۂ عدل اور عدالتی نظام کو اس سطح تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

قرآن اپنے کسی دعوے کو مبہم اور ادھورا نہیں چھوڑتا۔ سورہ نساء کی اسی یعنی ۱۳۵ ویں آیت کو دیکھئے جس واضح انداز میں کہا گیا ہے کہ خواہ یہ گواہی والدین کے خلاف جائے یا عزیزوں کے خلاف۔ خواہ وہ مالدار ہوں یا محتاج ہوں۔ (اس کی پرواہ نہ کرو) کیونکہ تم اللہ کے گواہ ہو اور اللہ کا حق سب سے اونچا ہے۔ دیکھنا ان جذبات کے پیچھے نہ لگ جانا اور یہ نہ کرنا کہ ذو معنی الفاظ اور بین بین انداز میں گواہی دینا۔ پھر یہ بھی نہ کرنا کہ گواہی دینے سے پہلو تہی کرو کیونکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔

حضرات! یوں سچ کہنا اور عدل کو سربلند کرنا قرآن کی رو سے ایک مستقل قدر ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان ایسا کیوں کرے؟ سچی گواہی دے کر مصیبت میں کیوں پھنسے؟ والدین کو کیوں ناراض کرے۔ ذرا اپنے دل سے اس "کیوں" کا جواب مانگئے۔ غالب نے کہا تھا کہ۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم بے کیرکٹر اسی لئے تو ہیں کہ طبیعت ادھر نہیں آتی۔

قرآن نے اس کا طریقہ بھی بتایا ہے کہ طبیعت خود بخود اس طرف متوجہ ہو جائے۔ قرآن صرف احکام و قوانین ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اُن پر عمل کرنے کی راہیں بھی منور کرتا جاتا ہے۔

انسان مفاد پرست ہے۔ "تحفظِ خویش" کا جذبہ اُس کی فطرت میں بہت قوی ہے۔ بے ایمانی، جھوٹ، فریب اور رشوت کی یہی بنیاد ہے۔ اس مفاد پرستی کا علاج صوفیوں اور "روحانیوں" نے یہ بتایا کہ "ترکِ طلب" "ترکِ آرزو" اور "ترکِ دنیا"۔ ظاہر ہے کہ یہ علاج تصوراتی اور غیر حقیقی ہے۔ قرآن حقائق کا سامنا کرتا ہے۔ وہ کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھ بند کرنا نہیں سکھاتا۔ قرآن نے ان دونوں کی ہم آہنگی کا طریقہ بتایا ہے۔ انسان کو جب تک یہ یقین نہ ہو کہ اس کام سے میرا فائدہ ہے وہ کبھی وہ کام نہ کرے گا۔ کسی چیز کے متعلق یہ دلیل ایمان والوں کے لئے کافی ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے لیکن بالغ ذہنوں میں اس مرحلہ پر بھی "کیوں" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

قرآن نے انسان کو بالغ قرار دیا ہے۔ وہ جس بات کا حکم دیتا ہے اُس کے فائدے بھی سمجھا دیتا ہے۔ اگر پلاؤ کے کسی قاب میں سنکھیا ملا ہو تو کوئی دن کا بھوکا بھی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ لیکن ہمارا یہ نقطۂ نظر اُس قاب کے متعلق کیوں نہیں ہوتا جس کا پلاؤ حرام کی کمائی سے پکایا گیا ہو؟ وجہ یہ ہے کہ اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ یہ پلاؤ ہماری ذات کے لئے موت کا باعث ہوگا جیسے سنکھیا جسم کے لئے تو ہم ہرگز اسے ہاتھ نہ لگائیں گے۔

زندگی کے دونوں تصورات یعنی مغرب کے مادی تصور اور اسلام کے تصور کو سامنے رکھیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مادی تصور کے ماننے والوں کے نزدیک حیوانی سطح سے ابھرنے اور اگلی زندگی اور بلند تر اقدار کا تصور ہی مکمل اور واضح نہیں ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے انسانی ذات کو روحِ خداوندی قرار دیا ہے۔

کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ قصۂ آدم میں تمثیلی انداز میں یہ بات بھی کہی گئی ہے۔ وہ اولاد کے ذریعے زندگی کا تسلسل برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ابلیسی افسوں ہے جو انسان کے کان میں پھونکا گیا تھا۔ قرآن نے "ذاتِ انسانی" کو بقائے دوام کا ذریعہ بتایا ہے۔ اقبالؒ نے اس قرآنی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ؎

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح جسم کی نشوونما کے لئے قوانین ہیں، اسی طرح "انا" یا "میں" یعنی "ذات" کی نشوونما اور ارتقا کے لئے بھی قوانین ہیں۔ اور ذات کی نشوونما انہیں اقدار سے ہوتی ہے جو شرفِ انسانیت سے وابستہ ہیں۔

اب دیکھئے کہ ذات کا تحفظ بڑا فائدہ ہے۔ اور جسم کا تحفظ چھوٹا فائدہ۔ پھر آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ انسان وہی کام کرتا ہے جس میں اُس کا نفع ہو۔ اب عقلِ سلیم کا کام یہی ہے کہ وہ بڑے فائدہ کا تحفظ کرے۔

لوگوں نے ایمان اور عقل کے درمیان مصنوعی تضاد پیدا کر دیا ہے۔ لیکن قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ عقل بھی وہی کہتی ہے جو ایمان کا تقاضہ ہوتا ہے۔ ہاں اس کے لئے عقل کی سطح کو کچھ اور بلند کرنا ہوگا۔ عقل کا فریضہ اس جسم کی حفاظت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس صندوق (جسمِ انسانی) کے اندر چھپے ہوئے گوہرِ آبدار (ذاتِ انسانی) کی حفاظت بھی اس کا فرض ہے۔ ہمیں اپنی عقل کو یہی نکتہ سمجھانا ہے۔ اسی تربیت یافتہ عقل کو قرآن کریم نے "قلبِ سلیم" قرار دیا ہے۔ اور اسی کو اقبالؒ نے "ادب خوردۂ دل" کہا ہے۔

حضرات! یہی قلبِ سلیم کردار کی بنیاد ہے۔ اور ذاتِ انسانی کا تحفظ اس کا تقاضہ۔ خدا پر ایمان لانے سے پہلے اپنی ذات پر ایمان لانا پڑتا ہے کیونکہ اپنی ذات پر ایمان رکھنے والا خدا کا منکر ہو ہی نہیں سکتا۔

شاخِ نہالِ سدرۂ، خار و خسِ چمن مشو
منکرِ او اگر شدی، منکرِ خویشتن مشو

اور اس ایمان کے پیچھے کردار اور اعمالِ صالح تو یوں چلے آتے ہیں جیسے انسان کے پیچھے اس کا سایہ۔

پرویز صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔ شاید ہی کبھی انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ اپنے سننے والوں کو روکا ہو۔ لیکن آج دل کے درد، قوم کی حالت، روح کے اضطراب، موضوع کی اہمیت نے انہیں وقت فراموش بنا دیا تھا۔ اُن کی تقریر میں ایسی بے چینی تھی جیسے رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "ابوالہول کی روح اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے" یا جیسے کسی مسلمان نے چودہ صدیاں بیتنے کے بعد اپنے جذب و درد دل سے بلال حبشیؓ کی اذان سُن لی ہو۔ وہ اذان جو آج بھی زندہ ہے۔ وہ اذان جس میں محمد عربیؐ کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ اذان جو مسلمان کا اعلان نامہ ہے۔

پرویز صاحب نے کوئی دو گھنٹے تقریر کی۔ اُن کی مثالیں ہمیشہ موضوع کے پہلوؤں کو واضح کر دیتی ہیں لیکن آج انہوں نے اپنی تقریر میں کئی ایسی مثالوں سے کام لیا جن سے موضوع کا پس منظر اور پیش منظر یوں اُجاگر ہو گیا جیسے برسات کی تاریک رات میں بجلی گردوپیش کی ظلمتوں کو نور میں بدل دیتی ہے۔ بجلی کی چمک تو ایک دو لمحہ کی ہوتی ہے اور قرآن کے افکار کی چمک ابدی و دائمی ہے۔

تقریر جب ختم ہوئی تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ لیکن ذہنوں میں حق کی پہلی کرن مسکرا رہی تھی اور وہ صبح نہیں جو کبھی فردا اور کبھی امروز کا روپ دھار لیتی ہے بلکہ وہ سحر جو ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذان سے پیدا۔

۱۶ جولائی آج پرویز صاحب کا درسِ قرآن تو رات کو ہونا تھا لیکن آج کی شام بڑی اہم تھی۔ آج فرصت کے چند لمحے چرا کر پرویز صاحب اراکین بزمِ طلوعِ اسلام سے دل کی باتیں دل کی زبان میں کرنی چاہتے تھے۔

شفیع اور انور صاحبان ۲۸ جولائی کو لاہور سے واپس ہو گئے تھے۔ غمگین یوں تھے کہ کچھ اجتماعات میں شرکت نہ کر سکے اور خوش بھی تھے کہ ابھی کچھ اجتماعات باقی ہیں۔ انسان کی طبیعت بھی ایک طرفہ تماشا ہے وہ بیک وقت متضاد کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔

شفیع اور انور صاحبان کے بنگلے کے سبزہ زار پر شام کو رفیقانِ چمن جمع تھے۔ میاں عبدالخالق صاحب ایک آدھ تقریر پر تُلے بیٹھے تھے۔ لیکن پرویز صاحب نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا "آج ہم باتیں کریں گے۔ مل کر کچھ سوچیں گے تقریر نہیں چلے گی"۔

ایک دوست نے پریس اور اخبارات کا شکوہ کیا کہ وہ ہماری خبریں، اطلاعات، تقریریں اور نقطۂ نظر شائع نہیں کرتے۔ پرویز صاحب نے کہا کہ اس میں شکوہ کی کیا بات ہے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے پرچے میں جو چاہے چھاپے اور ہمارا کام تو بات پہنچا دینا ہے۔ جس بات کی ہم میں سکت نہ ہو یا جس کے لئے ہمارے پاس وسائل نہ ہوں، ہم اس کے لئے مکلف نہیں ہیں۔ مگر یاد رکھیے کہ ہر صحت مند نظریۂ حیات میں اُبھرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہاں ہمارے اعمال رفتار کو تیز اور مدت کو کم تر کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی عملی پروگرام بتایئے۔ ان لوگوں کے ذہن میں عملی پروگرام سے مطلب ہوتا ہے نعرے، ہنگامہ، شور و غوغا۔ کیا یہ تبلیغ اپنی جگہ ایک بڑا عملی پروگرام نہیں ہے؟ اور اس میں اس بات کا اضافہ کیجئے کہ جس کے ڈول کی رسی پانی تک نہ پہنچ رہی ہو اُسے اتنی رسی دے دیجئے کہ وہ پانی حاصل کر سکے۔ تبلیغ کے معنی یہ ہیں۔

ایک پُرجوش ساتھی نے پوچھا کہ ہم جب لوگوں تک اپنا پیغام لے کر جاتے ہیں تو وہ کٹھ حجتی پر اتر آتے ہیں۔ بحث و مباحثہ کرتے ہیں جو ناگوار صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کریں؟ پرویز صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: بحث سے ہمیشہ دامن بچایئے۔ بحث و مناظرہ دوسری چیز ہے اور کسی مسئلہ کی وضاحت دوسری چیز۔ جس میں کچھ حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے وہ پہلے دوسرے کی بات توجہ سے سنتا ہے اور پھر اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ بحث میں محض تضیعِ اوقات ہوتی ہے۔ اکبر نے کتنی سچی اور کھری بات کہی تھی ؎

فلسفی بحث میں نے کی بہت بپا ذاتِ حق عقل میں سمجھی ہی نہیں

ایک بات اور ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔ وہ یہ کہ کوئی دلیل میری نسبت سے لوگوں تک نہ پہنچایئے۔ یعنی یہ نہ کہیے کہ فلاں بات اس لئے صحیح ہے کہ پرویز صاحب نے ایسا کہا ہے۔ ہر مسئلہ کے بارے میں خود قرآن سے اپنے آپ کو مطمئن کر لیجئے اور جب کوئی شخص آپ کے جواب میں قرآن کی بات پیش کرے تو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کیونکہ بیچ میں قرآن آ جاتا ہے۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ بات کس نے پیش کی ہے؟ پیش کرنے والا کوئی بھی ہو بات تو قرآن کی ہے۔ اپنی اور اس کی دلیلوں کو پرکھیے اور اگر اس کا نقطۂ نظر درست ہو تو بلا تامل مان لیجئے۔

قرآن ہمارے لئے سندِ اول ہے اور اس کی تائید میں جہاں سے جو کچھ ملے لیتے چلے جایئے۔ قرآن وہ کسوٹی ہے جس کے

آپ احادیث، تفاسیر اور تاریخ کو پرکھ سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن نے حضور نبی اکرمؐ کے ساتھیوں (جماعتِ مومنین) کی ایک پہچان یہ بتائی ہے کہ یؤثرون علیٰ انفسھم۔ اور پھر ہمیں تاریخ میں ایک صحابی کا واقعہ ملتا ہے کہ جنگِ بدر کا ایک قیدی اُن کے یہاں مہمان تھا۔ قیدی اور وہ بھی جنگ کا۔ صحابی کی آمدنی اتنی کم اور وسائل کتنے محدود تھے کہ رات کو دو آدمی دسترخوان پر پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ کھا سکتے تھے۔ جب وہ اپنے مہمان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے تو کسی بہانے سے چراغ گل کر دیتے۔ خود بھی منہ چلاتے اور ہاتھ دسترخوان سے منہ تک لے جاتے اور مہمان سیر ہو کر کھانا کھا لیتا۔ اس واقعہ کو ہم اس لئے صحیح مان لیں گے کہ قرآن نے مومنین کی جو صفت بیان کی ہے یہ اس کے مطابق ہے۔

اسی طرح عہدِ اول کے مومنین یعنی صحابہ کرامؓ کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ وہ اعلیٰ ترین انسانی اور اخلاقی سطح پر تھے اسی لئے ان کے بارے میں ہم ایسی روایت قبول نہیں کر سکتے جو اُن کے کردار کو رقابت یا باہمی نفرت سے داغدار بتائی ہو۔ ویسے یہ یاد رکھئے کہ اسلاف کے بارے میں ہم سے روزِ جزا خدا کچھ نہ پوچھے گا۔ یہ سوال نصاب سے باہر ہے اور وہ بڑا منصف ممتحن ہے۔ ہم نے کچھ مسائل اور قدریں خود ہی پیدا کر لی ہیں اور انہیں میں الجھے رہتے ہیں۔"

روح کی بے چینیاں سوال بن کر ہونٹوں پر آ رہی تھیں۔ ایک دوست نے قرآن کے مطالعہ کی شرائط اور آداب دریافت کئے۔ پرویز صاحب نے کہا کہ تعریف آیات اور ایسی دوسری شرائط کے بارے میں، میں بارہا لکھ چکا ہوں۔ بہرحال سب سے اہم شرط "مطہر" ہونا ہے۔ یہ طہارت صرف جسم تک محدود نہیں بلکہ قلب اور دماغ کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم بہت غیور ہے اور اسی سے بات کرتا ہے جو شرک سے پاک ہو کر آئے۔ اگر ہم اپنے خود ساختہ نظریوں کی تائید کے حصول کے لئے قرآن کی بارگاہ کا رخ کریں گے تو اس کے دروازے بند پائیں گے۔"

اسی طرح کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے باتیں ہوتی رہیں۔ باتیں کرتے ہوئے قرآن حکیم کے بارے میں پرویز صاحب نے کہا کہ اندھیرے میں ہم رسی کو سانپ سمجھ کر ڈرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم حواس جلا لیں تو منظر واضح ہو جاتا ہے۔ اور خیالی سانپ، رسی کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے نور میں توہمات کے سانپ اپنی اصلی شکل میں سامنے آ جاتے ہیں اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ جنہیں ہم سانپ سمجھتے تھے وہ درحقیقت رسیاں تھیں۔ قرآن کا نور ہر چیز کے مقام کا تعین کر دیتا ہے اور ہر چیز کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔

مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ اسی لئے گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ گفتگو ختم کرنے سے پہلے آخر میں پرویز صاحب نے بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے رفقاء کی ہمت اور کارکردگی کو سراہا اور اُن سے کہا کہ آپ یوں ہی اجر سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے رہئے۔ آپ کا اجر آپ کے خدا کے پاس ہے اور عملے کے خیال کے بغیر اللہ کی راہ میں بڑھتے جانا ہی سنتِ محمدیؐ ہے۔ یہی امتِ مسلمہ کے لئے میراثِ پیغمبری ہے۔ پرویز صاحب نے میاں عبدالخالق صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کو اُن کی مسلسل کوششوں پر مبارکباد دی۔ میاں صاحب نے اپنے سیدھے سادے انداز میں کہا کہ اس کامیابی کا سبب میرے

ساتھی اور رفقا ہیں۔ جنہوں نے "مشاورت" اور "تعاون" کو مستقل اقدار سمجھ کر ان قدروں کا حق ادا کر دیا ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد پرویز صاحب نے حسب معمول مختصر سا کھانا کھایا — خود کم کھایا، دوسروں کو کھلاتے ہوئے دیکھتے رہے گھڑیاں ٹک ٹک کو آخر کیا کہا جائے۔ مانا کہ گھڑیاں لیے ہوئے سالفظ ہے۔ جی چاہتا ہے تو دیواری گھڑی کہہ لیجئے۔ انہے نو بجائے بولاگی کا ہنگام ہی گیا۔ آج رات سندھ اسمبلی ہال میں دوسرا درس قرآن تھا۔ موضوع تھا۔ "وحدت ملت" اس درس کو پہلے درس "قومیت اور اسلام" کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی لئے پرویز صاحب نے گذشتہ درس کے نتائج سے اس درس کے آغاز کا رشتہ جوڑا۔

"قرآن وہ تمام غیر فطری امتیازات مٹانے آیا تھا جن کی بنیاد پر انسانوں نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور بتایا کہ انسانوں کے درمیان فرق صرف نظریۂ حیات کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ یہ جماعت مومنین جو دنیا کو پیام وحدت انسانیت دینے آئی تھی خود ہر خطہ میں مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟"

اور پھر پرویز نے قرآن کی روشنی میں اس "کیوں" کا جواب دیا۔ یہ داستان بڑی دل گداز ہے کہ اس قوم کو غیر سازشوں، ملوکیت اور ملائیت کے مشترکہ تیزاب نے کس طرح پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اُن کے درس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"اسلام انسانیت کو عالمگیر برادری بنانے آیا تھا۔ اور آج خود مسلمان ایک وحدت نہیں ہیں۔ مسلمان دین کا اصل الاصول "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا" بھول گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم اپنی عظمت کھو بیٹھی جس کے لئے کہا گیا تھا کہ وہ تمام بنی نوع سے یکساں فاصلے پر ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) یوں مسلمان دوسروں کا نگران تھا اور رسولؐ یعنی مرکز امت مسلماں کا نگراں۔ وحدت کی یہ تعلیم نئی نہ تھی۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مجتبیٰؐ سب کو یہی ربانی تعلیم دی گئی کہ نظام دین قائم کرو تاکہ مسلمانوں سے تفرقے مٹ سکیں۔

"شرک جہالت سے پیدا ہوتا ہے لیکن فرقہ پرستی کی بنیاد مفاد پرستیوں پر ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ اُن کی ذلت و تباہی اور زوال کا سبب یہی تفریق تو تھی۔

اللہ کی طرف سے تعلیم لے کر انبیائے کرام کی آمد کے بعد فرقے باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کا مقصد باہمی اختلافات کو مٹانا ہے۔ قرآن نے بار بار اتحاد و وحدت کی تلقین کی ہے جو نشانیوں کے آنے کے بعد تفرقہ پیدا کرتے ہیں "أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۵) قرآن نے تفرقہ اندازی اور فرقہ سازی کو عملی شرک قرار دیا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۰/۳۱) مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) (اور تم مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے فرقے ہو گئے اور ہر گروہ اسی پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے)

"لیکن بد نصیبی دیکھئے کہ قیام صلوٰۃ کبھی اتحاد کا نشان تھا اور آج نماز ہی اختلافات کے اظہار کی علامت ہے۔ یہ

اس امت کی کیفیت ہے جس کے اتحاد کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ہے اس قوم کی نشانی یہ تھی کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

رسولِ اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے بعد وحدتِ ملت پارہ پارہ ہو گئی ۔ اور یہ ملت اپنی توانائی کھو بیٹھی ۔ آج لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ فرقے اب مٹ ہی نہیں سکتے ۔ لیکن قرآن کے نسخۂ کیمیا پر عمل کر کے ہم آج بھی امتِ واحدہ بن سکتے ہیں ۔

"اس نسخۂ کیمیا کا پہلا جزو یہ ہے کہ اختلافی مسائل کا فیصلہ کتاب اللہ کی روشنی میں کیا جائے ۔ قرآن نے اپنے کتاب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں (۴/۸۲) اور کتاب اللہ کو عملی صورت میں نافذ کرنے کے لیے اسلامی نظام ناگزیر ہے ۔ کتاب اللہ اور اسوۂ حسنۂ نبوی کی پیروی کو زندہ حقیقت اسلامی نظام کے بغیر نہیں بنایا جا سکتا ۔ اسی لیے اسلامی مرکزیت لازم ہے ۔ حضورؐ کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے قیام کا مقصد ملت کی مرکزیت کو برقرار رکھنا تھا ۔ جب تک خلافت رہی مسلمان فرقہ سازی سے محفوظ رہے ۔ لیکن جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو ملت مختلف فرقوں میں بٹ گئی ۔

وحدتِ ملت کی یہی صورت ہے کہ ہم ایک مرکزی نظام کے قیام کے لیے اپنی توانائیوں کو وقف کر دیں تاکہ وہ مرکزی اتھارٹی تمام اختلافات کو کتاب اللہ کی روشنی میں دور کر دے ۔ یہی سنتِ رسول اللہؐ ہے اور یہی وحدتِ ملت کے حصول کا واحد ذریعہ ہے ۔ ہمیں فرقوں کے پیدا ہونے پر تو کوئی اختیار نہ تھا لیکن کتاب اللہ کی موجودگی میں ان کو ختم کرنے کا اختیار تو ہے ۔"

یہ پرویز کی آواز نہیں ہے ۔ یہ قرآن کا پیغام ہے ۔ زمانہ اس پیغام کو دہرا رہا ہے ۔ پرویز کی اس بات سے کوئی معقول فرقہ ساز بھی نظری طور پر اختلاف نہیں کرتا ۔ لیکن عمل کے راستے میں مفاد پرستی کی دلدل آ جاتی ہے ۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ قرآن کی آواز اس دلدل پر اتحاد کا پل تعمیر کر کے رہے گی ۔ ملتِ اسلامیہ کو ساری دنیا میں بازآفرینی کا جو موقع ملا ہے وہ رائیگاں نہ جائے گا ۔ کچلی ہوئی انسانیت مسلمان کو اسلام کے نام پر دہائی دے رہی ہے کہ

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

رات کے سوا گیارہ بجے کے قریب بزمِ نگہت کی یہ محفل برخاست ہوئی ۔

۷ جولائی

آج شام ہوٹل میٹروپول کے وسیع و حسین سبزہ زار پر پرویز صاحب کی آخری تقریر تھی ۔۔۔ "انسانی معاشرہ میں مستقل اقدار کی اہمیت" ۔ میٹروپول کا لان جسے میں نے اپنی وسعتوں پر ہمیشہ نازاں پایا ہے آج تنگیِ داماں کا شاکی تھا ۔ ہوٹل اور پھر مغربی انداز کے ہوٹل کے تصور کے ساتھ ذہن میں ساز و رقص اور موسیقی کا خیال ابھرتا ہے ۔ ہوٹلوں میں لوگ زندگی کی دلچسپیوں سے اپنا حصہ مانگنے یا اپنے آپ کو دھوکہ دینے آتے ہیں ۔ لیکن آج یہاں آنے والے سوچنے اور

سمجھنے کے لئے آئے تھے ان کا آنا ہی اس بات کی شہادت تھی کہ ان کے نزدیک زندگی "راک اینڈ رول" نہیں ہے بلکہ زندگی ایک سنگین محکم اور صالح حقیقت ہے۔ اور یہ اقدار عالیہ ہی ہیں جو زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے شرف انسانیت کی نمود بنا دیتی ہیں۔

ساڑھے پانچ بجے جلسہ کا آغاز ہوا۔ میاں عبدالخالق نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی نے اپنی تمہیدی تقریر میں کہا۔

"اتنی بڑی تعداد میں آپ کا یہاں تشریف لانا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ قرآن کی آواز آہستہ آہستہ دلوں کی گہرائیوں میں جگہ بنا رہی ہے۔ آج محترم پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع "انسانی معاشرہ میں مستقل اقدار کی اہمیت" ہے۔ مستقل اقدار کے بغیر انسانیت بہت دور تک آگے نہیں بڑھ سکتی ہے اور مستقل اقدار کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔ ورنہ انسانوں کی بنائی ہوئی قدروں پر عالم انسانیت کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں..... اسلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان خدا کی عطا کی ہوئی مستقل قدروں کے تحت اپنی اجتماعی زندگی بسر کریں اور جس دن ان قدروں کو انسانوں نے اپنی مشترک میراث بنا لیا۔ سارے انسان ایک قوم اور ایک ملت بن جائیں گے"۔

میاں عبدالخالق نے بزم طلوع اسلام کراچی کی سرگرمیوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہر اتوار کو صبح نو بجے سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل میں پرویز صاحب کا درس قرآن ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ بزم اہم دینی اور اجتماعی مسائل پر اپنے پمفلٹ بلاقیمت تقسیم کرتی ہے اور "سلیم کے نام" کی دو سو جلدیں تحفۃً دی گئی ہیں۔ میاں صاحب نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ قرآنی فکر کی اشاعت کے لئے بزم سے مستقل طور پر رابطہ قائم رکھیں۔ انھوں نے اس کی صراحت کی کہ بزم طلوع اسلام نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے اور نہ سیاسی جماعت۔ وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔ اُن کی تقریر سے پہلے ایک خلصے پڑھے لکھے آدمی اپنے ساتھی سے "مستقل اقدار کے معنی پوچھ رہے تھے لیکن جب تقریر شروع ہوئی تو مجھے کسی چہرہ پر وہ کیفیت نظر نہ آئی، جو نہ سمجھنے کی علامت ہوتی ہے۔ پرویز صاحب کا قلم تو علمی اصطلاحوں کی وادیوں میں کبھی کبھی اپنے پڑھنے والوں کو حیران چھوڑ دیتا ہے لیکن ان کی تقریر تو وہ جوئے فکر ہوتی ہے جو اپنی روانی میں مشکلوں کے پتھر کو مثالوں کی مدد سے بہلائے جاتی ہے۔ اس تقریر کے بارے میں مجھے بھی یہ شک تھا کہ کہیں بہت سے سننے والے مایوس نہ لوٹیں۔ لیکن پرویز صاحب نے مجھے مایوس کر دیا۔ بات کہنے کا سلیقہ ہو تو ہماری قوم کے ذہن بنجر نہیں ہیں۔ بات اور فکر میں نمی ہو تو ذہن کی مٹی ابھی بہت زرخیز ہے۔

تقریر کے بڑے حصے میں پرویز صاحب نے اس بات کی وضاحت کی کہ انسانوں کی قدریں کس درجہ اضافی ہیں۔ کچھ اس بات پر غمگین ہو جاتے ہیں کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے کیوں ہیں؟ اور کچھ اس بات پر خوش کہ کانٹوں کے ساتھ پھول تو ہیں۔ ایک شخص کے سامنے دودھ کا آدھا گلاس رکھا ہے اور وہ اداس ہے کہ گلاس آدھا رہ گیا۔ دوسرے کے سامنے بھی آدھا گلاس ہے اور وہ خوش ہے کہ ابھی آدھا گلاس باقی ہے۔ اسی طرح بچپن میں جن چیزوں کو ہماری نظر میں بڑی قدر حاصل ہوتی ہے

جمانی میں ہم اُن پر ہنستے ہیں۔

یہی عالم انسانیت کی کیفیت ہے۔ انسان کی ذاتی قدروں کی تشکیل نہ کر سکا۔ پرویز صاحب نے لاک اور ہابس سے لے کر جوڈ اور وہائٹ ہیڈ تک انسانی ذہن کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کی رپورٹ کا حصل بتایا اور کہا کہ اب تو مغرب کے مفکرین بھی یہ بات ماننے لگے ہیں کہ اکثریت کا کسی بات پر متفق ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ بات درست اور حتمی ہے۔

یہ صورت حال ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ مستقل اقدار کا سرچشمہ صرف وحیٔ الٰہی ہو سکتی ہے۔ وحی انسانیت کو مستقل اور غیر متبدل اقدار دے سکتی ہے۔

قرآن نے تیرہ سو سال پہلے جو مستقل اقدار عطا کی تھیں۔ آج انسانی ذہن اُن کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ ان اقدار کو نافذ کیسے کیا جائے؟ یہ بات وہی بتا سکتا ہے (اور اسی نے بتائی ہے) جس نے یہ اقدار عطا کی ہیں۔

قرآن کی اقدار ہمیشہ کے لئے ہیں۔ اس کی دلیل "ختم نبوت" ہے۔ اب کوئی نبی، کوئی نئی قدر لے کر نہ آئے گا نہ کوئی ان اقدار میں تبدیلی کر سکے گا۔

وقت کی کمی کے سبب پرویز صاحب قرآنی اقدار حیات پر مفصل گفتگو نہ کر سکے۔ لیکن اس موضوع پر انھوں نے مختلف مضامین میں جو کچھ لکھا ہے، جلسے کے اختتام پر انھیں پمفلٹوں کی شکل میں بند لفافوں میں حاضرین کو بزم کی جانب سے دیا گیا۔

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ میں اس اہم تقریر کے تذکرہ سے بڑی روا روی میں گزر گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ میرا اٹھتیسواں صفحہ ہے اور آج اکتیس تاریخ ہے۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ جہاز دو بجے لاہور کے لئے روانہ ہو جاتا ہے اور مجھے یہ مسودہ پی آئی اے کے دفتر پہنچانا ہے تاکہ آپ اگست کے طلوع اسلام کے ذریعہ پرویز صاحب کے "دورۂ کراچی" کے اجتماعات میں شریک ہو سکیں۔ اگر میں اس تقریر کی کیفیتوں میں کھو گیا تو آپ کو ایک مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اور انتظار کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔

اس اجتماع کے ساتھ تقریروں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن اب پرویز صاحب کی قیام گاہ، جلسہ گاہ بن گئی کتنے ہی لوگ اپنے سوالوں اور دل کی پیاس کے ساتھ آتے رہے۔ بعض سوال سن کر کبھی کبھی مجھے ہنسی روکنی پڑتی۔

"ثواب اور اعمالِ صالحہ ایک ہی چیز ہیں؟"

"قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز کیوں پڑھی جاتی ہے؟"

"سنا ہے کہ بیت المقدس میں ایک نماز کا ثواب سات نمازوں کے برابر اور خانہ کعبہ میں ستائیس نمازوں کے برابر ہوتا ہے"

"چھینک آجائے تو پہلے الحمد للہ کہنا چاہیئے یا کچھ اور"

لیکن پرویز صاحب ہر سوال کو انتہائی محویت سے سنتے، انتہائی محبت سے جواب دیتے، سوال سے سوال پیدا ہوتا، وہ اس کی وضاحت کرتے۔ دوسرے کی کٹھ حجتی سے ماتھے پر شکن نہ آتی۔ میں نے سوچا کہ یہ ہنسنے یا مسکرانے کا موقع بھی نہیں۔ سات آٹھ سال پہلے میری بھی تو یہی کیفیت تھی کہ اپنی اور اپنے اسلاف کی بنائی ہوئی قدروں کا اسیر تھا۔ یہ روحیں اسی دور سے گزر رہی ہیں۔ ان کے روحانی کرب کا احترام لازم ہے۔

دو دن یوں ہی گزر گئے۔ آخر بیس جولائی آگئی۔ آج پرویز صاحب کو رخصت ہونا تھا۔ اگر میاں عبدالخالق کی ظرافت آڑے نہ آجاتی تو پرویز صاحب کچھ اور خاموش ہو جاتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پرویز صاحب کٹھن سے کٹھن مشکلات کا کوئی اثر اپنے اوپر نہیں لیتے لیکن احباب سے رخصت ہوتے وقت ان کے دل کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ براہ راست تو میں کوئی بات ان سے نہ کہہ سکتا تھا لیکن جب غالب کی شاعری کا ذکر چھڑا تو میں نے پرویز صاحب کو یہ شعر سنا ہی دیا ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اور وہ مسکرا پڑے۔

ایک بجے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں کتنے ہی دوست منتظر تھے۔ یہ لمحے پرویز صاحب کے لئے بڑے سخت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو فانی کی ہم زبانی کرتے ہوئے اپنے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ع ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں۔

آخر ایک آواز سنائی دی۔

"پی آئی اے کے مسافر صاحبان! تشریف لے چلئے" پرویز صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب دوسرے مسافر جہاز کی طرف بھاگ رہے تھے پرویز صاحب نے انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور جہاز کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاز کی سیڑھیوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا، ہاتھ ملایا۔ ہاتھ کی ہر جنبش اخوت و محبت کی ایک داستان تھی، ہر جنبش میں گزرے ہوئے دنوں کی محبتوں کی یاد تھی۔ اور

صبا کے ہاتھ کی نرمی تھی اس کے ہاتھوں میں

پھر پرویز صاحب اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئے۔ جہاز رن وے پر بھاگنے لگا اور دوسرے ہی لمحے وہ ہوا کے دوش پر تھا۔

ایک گھنٹہ بعد میں صدر کی ایک سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں گم یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرے شب و روز میں یہ آہنگ وقت کی یہ پابندی کیسے برقرار رہے گی؟ پھر مصروفیتوں اور وقت کی گرفت مجھ پر حاوی ہو جائے گی۔ زندگی ویسے ہی

گزرے گی جیسے گزرتی آئی ہے۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہی ترکیب یاد آتی ہے۔ "کوشش بے ہودہ"

"نہیں اب ایسا نہیں ہوگا" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر پرویز صاحب کے کہنے سے میں ایک باقاعدہ آدمی بن سکتا ہوں تو قرآن کو اپنی رگوں میں گردش کرنے والا خون بنا کر میں اس جماعت کا فرد بھی بن سکتا ہوں جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

یہ میری تقدیر ہے۔ مجھے جنت ان کی حیثیت بدلنے سے پہلے اپنے آپ کو بدلنا ہے۔ اور میں اکیلا کب ہوں۔ خدا کی کائناتی طاقتیں میرا ساتھ دیں گی۔ میرے ساتھی میرے ساتھ ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ.

بقیہ "لمعات" صـ۷

اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا یہی عملی مفہوم ہے۔

لیکن یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے جن کی ساری عمر فرقوں کی گرہوں کو مضبوط رکھنے میں صرف ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات طلوع اسلام کو کبھی (جو فرقوں اور پارٹیوں کو قرآن کی رُو سے شرک سمجھتا ہے) کبھی مذہبی فرقہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی سیاسی پارٹی۔ ان کی غلط مذہبی تعلیم نے ان کے ذہن کی افتاد ہی اس قسم کی بنا دی ہے۔ اللہ ان کی حالت پر رحم کرے۔

قوم کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام　　(اقبالؒ)

"فجر الاسلام"

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی معرکہ آرا کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوگیا۔ ساڑھے آٹھ سو صفحات۔ قیمت صرف۔ آٹھ روپے (۸) پیشگی خریداران ہیں سے جو صاحب اس کتاب کو منگانا چاہیں، وہ براہ کرم دس اگست تک اطلاع دیدیں جن کی طرف سے اطلاع موصول نہ ہوئی۔ انھیں کتاب بھیجدی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ کتاب پہلے "اسلام کی سرگزشت" کے عنوان سے طلوع اسلام میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے۔

مکتبہ طلوع اسلام۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بیادگارِ اقبالؒ

معرکۂ دین و وطن میں بصیرتِ قرآنی کا لازوال شاہکار

(علامہ اقبال کا وہ تاریخی بیان جو ضربِ کلیم ثابت ہوا)

—— (قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا) ——

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ہمارے ملی شعور کو جو لعل و گہر عطا کئے ہیں ان کی مثال گذشتہ کئی صدیوں سے ہماری تاریخ میں ناپید نظر آئے گی۔ ۲۱ اپریل حضرت علامہ کا یوم وفات ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ امسال اس تقریب پر حضرت علامہ کا وہ معرکہ آرا بیان شائع کیا جائے۔ جس میں اسلام میں قومیت کے بنیادی اصول کی حقیقت سے تمام پردے اٹھا دیئے گئے تھے اور اس باب میں قرآنی تعلیم کو اس انداز سے واشگاف کیا تھا جو فکرِ اقبال کی منفرد خصوصیت تھی۔ چنانچہ اس بیان کی کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن مئی اور جون کے مشترکہ شمارہ میں دیگر مضامین نے اتنی جگہ گھیر لی کہ اس مقالہ کے لئے گنجائش نہ رہی۔

اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اسے اشاعتِ حاضرہ میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

اس معرکہ آرا بیان کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں جبکہ اس وقت جبکہ برصغیر ہند کے مسلمان اپنی جداگانہ قومی حیثیت کا پرچم لے کر اٹھے تھے اور مسلم لیگ ان کی اس قومی حیثیت کی آئینی و قانونی توثیق کے لئے کانگرس سے برسرِ پیکار تھی نیشنلسٹ مسلمانوں کے پیشوا اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی (مرحوم) نے دلی کی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ ایک مشہور و معروف مذہبی پیشوا کی زبان سے یہ نعرہ؟ شاید مسلمان اس فتنۂ عظیم کو جو اس نعرے میں پوشیدہ تھا ایک عرصہ تک سمجھنے کے قابل نہ ہوتے اور "شیخ الہند" کی یہ آواز کانگریس کے جاہ بھائی عزائم کے حق

میں اپنا کام کر جاتی۔ لیکن علامہ مرحوم جو ان دنوں بسترِ مرض (بلکہ مرض الموت) پر پڑے تھے۔ اس نعرے کی فتنہ انگیزیوں کو نظر انداز نہ کرسکے۔ ایسی شدید علالت کے باوجود ملت کا یہ قلبِ حساس تڑپ اٹھا اور اس کی یہ تڑپ و خلش اس آہِ آتشیں کی صورت میں لبوں تک آگئی۔

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے نیشنلسٹ حلقہ بگوش اس سے بڑے طیش میں آئے اور بالخصوص مولانا موصوف نے اس کے جواب میں ایک بیان شائع کرکے جہاں علامہ اقبالؒ کو عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا وہاں "قاموس" کے حوالوں سے "قوم" اور "ملت" کا فرق واضح کرنے کی بھی کوشش کی اور یہ کہا کہ انہوں نے (جیسا کہ علامہ اقبال کے مذکورہ شعر میں کہا گیا ہے) اپنی تقریر میں "ملت" نہیں بلکہ "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ علامہ اقبال کے نزدیک مولانا مدنی کی یہ کوشش "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف تھی۔ چنانچہ وہ ان پیدا کردہ فتنوں سے ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کو بچانے کے لئے غیرت دینی سے مسلح ہو کر میدان میں آگئے اور بیماری کے عالم ہی زیرِ نظر تاریخی بیان جوانہ اشاعت کیا۔ "معرکۂ دین و وطن" کی اس آویزش میں جو اس وقت ملک میں جاری تھی اس بیان نے ضربِ کلیم کا کام دیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے تمام قلعے مسمار ہو کر رہ گئے۔ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمان کی منزل پوری طرح نکھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور دین کا عطا فرمودہ قومی تصور (وطنی قومیت کے نظریئے کو شکستِ فاش دے کر) اساسِ دین پر ایک جداگانہ مملکت (پاکستان) کو معرضِ وجود میں لانے میں کامیاب و کامران ہو گیا۔

اس بیان کے آخری حصہ (مقامِ محمدی کے عنوان) میں ایک اور عظیم حقیقت کی بھی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ آج جبکہ ان عرب ممالک سے جو اسلام کے اولیں وارث ہونے کے مدعی ہیں نسل کی بنیادوں پر "وحدتِ عربیہ" کا نعرہ بلند ہو رہا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس نعرے کو عین اسلام بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا اعجاز دیکھئے کہ بیان کے اس حصے میں (اور بعینہٖ اسی نعرے کے الفاظ میں) "وحدتِ عربیہ" کا ذکر بھی موجود ہے۔ سوچئے کہ آج سے بائیس برس پہلے جبکہ "وحدتِ عربیہ" کے اس نعرے کی کوئی آواز نہ تھی اس دانائے راز کی بصیرتِ قرآنی کیا کچھ بھانپ چکی تھی اور پکار رہی تھی کہ "حضور رسالتمآبؐ کے لئے (وحدتِ عربیہ) کی یہ راہ بہت آسان تھی لیکن" (اور یہ لیکن بڑا اہم ہے)۔

اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو...... یہ راہ ایک وطن پرست کی راہ ہوتی
نبی آخر الزمانؐ کی راہ نہ ہوتی۔

یہ ہے بصیرتِ قرآنی کی دور اندیشیوں کا وہ اعجاز جس کی بنا پر اس تاریخی شاہدہ کو ہر دور میں ہمارے لئے مشعلِ راہ

(LAND MARK) کا درجہ حاصل رہے گا۔ اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر آج ہم اقبالؒ کی یاد میں اس کی اشاعت کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے اپنے مصرع ؎

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ "ملت" "قوم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی بالخصوص قرآن مجید میں یہ لفظ "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن حال کی عربی۔ فارسی اور ترکی زبان میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "ملت" "قوم" کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم "ملت" بمعنی "قوم" ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ لفظ "ملت" کے معنی زیرِ بحث مسائل پر چنداں موثر نہیں ہیں اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کا ارشاد یہی تھا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔

یورپ کی ملوکانہ اغراض اور نظریہ وطنیت

مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں۔ ایسے مشورہ سے "قومیت" کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے۔ جس کی تنقید ایک مسلمان کے لئے ازبس ضروری ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا مقصود ہے۔ حاشا وکلا میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جبکہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "فرنگی نظریہ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے۔ اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریئے ان کے لئے جاذبِ نظر ہیں۔ مگر افسوس

لو نہ گرد و کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے "اقوام" "اوطان" کی طرف اور "اوطان" "اقوام" کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کرہ ارض کے اس حصہ میں بودوباش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ "وطن" کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ اور۔ کل تک اہلِ برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اسلام اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ

مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو نا معقول و مردود ہے۔ اس مسئلے سے بعض سیاسی مباحث پیدا ہوتے ہیں جن کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا مسلمان اور قوموں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے؟ یا ہندوستان کی مختلف قومیں باہمی ملکی اغراض کے لئے متحد نہیں ہو سکتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ میرا مقصد اس وقت صرف مولانا حسین احمد صاحب کے قول کے دینی پہلو کی تنقید ہے اس لئے میں ان مباحث کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوں۔

اسلام واحد اجتماعی نظام ہے

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا ہی داعی نہیں، بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخِ ادیان اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" "قومی" تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں "نسلی" قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ "دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔" جس

سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ "دین" چونکہ پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس لئے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف "اسٹیٹ" ہے۔ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی ہے۔ نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ ملکیت بلکہ خالصتاً "انسانی" ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل "قوم" اور "نسل" پر بنا نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کہا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک "امت" کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے۔

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

مسلمانوں کو بروقت انتباہ

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہو گی اور شرفِ انسانی کے خلاف ہو گی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہیں بن سکتی تھی۔ انھوں نے یہ اساس "وطن" کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا۔ اور ہو رہا ہے ان کے اس انتخاب کا؟ لوتھر کی "اصلاح" "غیر سلیم "عقلیت" کا دور۔ اصول "دین" کا "سٹیٹ" کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ۔ یہ تمام قوتیں دھکیل کر یورپ کو کس طرف لے گئیں؟ لادینی۔ دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف کیا مولانا حسین احمدؒ یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اسی تجربہ کا اعادہ ہو؟ مولوی صاحب زمانہ حال میں "قوم" کے لئے "وطن" کی اساس ضروری سمجھتے ہیں۔ بے شک زمانہ حال نے اس اساس کو ضروری سمجھا ہے۔ مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ کافی نہیں۔ بلکہ بہت سی اور قوتیں بھی ہیں جو اس قسم کی "قوم" کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً "دین" کی طرف سے بے پروائی۔ روزمرہ سیاسی زندگی میں انہماک۔ و علیٰ ہذا القیاس۔ دیگر موثرات جن کو مدبرین اپنے ذہن سے پیدا کریں۔ تاکہ ان ذرائع سے اس قوم میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ مولوی صاحب اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر ایسی "قوم" میں مختلف ادیان داخل ہوں تو بھی رفتہ رفتہ وہ تمام "ملتیں" مٹ جاتی ہیں اور صرف لادینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک رہ جاتی ہے۔ کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو "دین" کو انسانی زندگی کے لئے ضروری جانتا ہے نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو۔ باقی رہے مسلمان! سو افسوس ہے کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریۂ وطنیت کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں۔ اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن" بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گی۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

اگرچہ جو فتنہ مولانا حسین احمدؒ کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج

ہے۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ ذیل سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف۔ گوارا فرمائیں گے۔

مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ امتِ محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے لفظ "قوم" استعمال کیا یا لفظ "ملت" ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امتِ محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا ہے۔ لیکن یہ احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انھوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے "ملت" اور "قوم" کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ "ملت" کو "قوم" سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے گا جو دینِ اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں۔ واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔

دینی وحدت میں مذہب و سیاست کی ثنویت

آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت "قوم" اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت "ملت" اور۔

دوسرا یہ کہ از روئے "قوم" چونکہ وہ "ہندوستانی" ہیں۔ اس لئے "مذہب" کو علیحدہ چھوڑ کر انھیں باقی اقوامِ ہند کی "قومیت" یا "ہندوستانیت" میں جذب ہو جانا چاہیئے۔ یہ صرف "قوم" اور "ملت" کے الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اور جسے اختیار کرنے کے لئے اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما کئی دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو۔ اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔

قرآن سے استشہاد کیوں نہیں؟

مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ میں نے لفظ "ملت" اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا اور میں "ملت" کو "وطنی قوم" سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے گویا اگر "قوم" زمین ہے تو "ملت" بمنزلہ آسمان ہے۔ لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی۔ اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم اور قومیت کو آسمان بناؤ۔ دینِ فطرت، زمین بنتا ہے تو بننے دو۔

مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے "قوم" اور "ملت" کے معانی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں "قاموس" کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے زبانِ عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر مولانا میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گذر کر قرآنِ حکیم

کی طرف رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ مقدس وحی سے بھی استشہاد فرما لیتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالمِ دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کونسی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف "قاموس" پر اکتفا کی؟ قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ "قوم" استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں "ملت" کا لفظ بار بار نہیں آیا؟ آیاتِ قرآنی میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے؟ اور کیا جماعتِ محمدیؐ کے لئے ان الفاظ کے علاوہ لفظ "امت" بھی آیا ہے یا نہیں؟ کیا اس الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معانی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ ذہنی یا شرعی اعتبار سے تو وہ قوانین الٰہیہ کا پابند ہو۔ اور ملکی اور وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی جو ملی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا قرآن سے استشہاد کرتے تو اس مسئلہ کا حل خود بخود ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ آپ نے الفاظ کی جو لغت بیان فرمائی۔ وہ بہت حد تک درست ہے۔ قوم کے معنی جماعۃ الرجال فی الاصل دون النساء ہے۔ گویا لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں جہاں قوم موسیٰ اور قوم عاد کے الفاظ آئے ہیں۔ وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ "ملت" کے معنی بھی دین و شریعت کے ہیں۔

اہم سوال لیکن سوال ان دونوں لفظوں کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان

اولاً۔ اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معرف جماعت ہیں۔ جس کی اساس توحید اور ختم نبوت پر ہے یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک یا رنگ و زبان ان کے مقتضیات کے تحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام و قانون کے ماتحت کوئی اور حیثیت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟

ثانیاً کیا ان معنوں میں بھی قرآنِ حکیم نے اپنی آیات میں انھیں لفظ "قوم" سے تعبیر کیا ہے؟ یا صرف لفظ ملت یا امت ہی سے پکارا گیا ہے۔

ثالثاً اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے؟ کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو! یا اے مومنو! "قوم مسلم" میں شامل ہو جاؤ۔ یا اس کا اتباع کرو۔ یا یہ دعوت صرف ملت کے اتباع اور امت میں شمولیت کی ہے؟

قرآن کریم میں ملت کا مفہوم جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملت یا امت وارد ہوا ہے کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے ومن احسن دیناً ممن اسلم وجہہ للہ و ھو محسن واتبع ملۃ ابراھیم حنیفاً۔ واتبعت ملۃ آبائی ابراھیم۔ فاتبعوا ملۃ

ابراھیم حنیفا۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لئے ہے کہ 'ملت' نام ہے ایک دین کا۔ ایک شرع و منہاج کا۔ 'قوم' چونکہ کوئی شرع و دین نہیں۔ اس لئے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث ہے۔ کوئی گروہ ہو۔ خواہ وہ قبیلہ کا ہو۔ نسل کا ہو۔ ڈاکوؤں کا ہو۔ تاجروں کا ہو۔ ایک شہر والوں کا ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو۔ وہ محض گروہ ہے۔ رجال کا یا انسانوں کا۔ وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف منسوب بھی کرتا ہے۔ مثلاً قوم نوحؑ قوم موسیٰؑ قوم لوطؑ۔ لیکن اگر اسی گروہ کا معتقد کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو وہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ مثلاً قوم عاد۔ قوم فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً جہاں قوم موسیٰؑ تھی وہاں قوم فرعون بھی تھی قال الملاء من قوم فرعون اتذر موسیٰ و قومہ لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے توحید کو تسلیم کرتے گئے وہ اس پیغمبر کی ملت میں آگئے۔ اس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین ملت کفار کی بھی ہو سکتی ہے انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ۔

ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملت ابراہیمی میں داخل ہو گئے۔ ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ "امت" کے لفظ سے۔

ان گذارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لئے سوائے امت کے اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اگر کہیں آیا تو ارشاد فرمایئے۔ "قوم" رجال کی جماعت کا نام ہے۔ اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن "ملت" سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی۔ خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔

کانگریسی علماء کی مجبوریاں

عصر حاضر کے ہندوستانی علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جو قرآن یا نبی امی کا منشاء ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے۔ جن کی وحی میں قوموں۔ نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۔ نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ موحد و مشرک اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت اسمٰعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور "قومیت" کی رد ا

اور پڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی وَاِذْ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک ۔

الکفرۃ ملۃ واحدۃ

کیا خدا کی بارگاہ سے امت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امت مسلمہ کے مقابلہ میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفرۃ ملۃ واحدۃ کی ہے۔

امت مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیّم ہے۔ دینِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کرنے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامقبول و مردود ہے۔

قریشِ مکہ سے جنگ کیوں؟

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لئے قابلِ غور ہے کہ اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر ملحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس کہ آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام دینِ قیّم امت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امت مسلمہ کو ہی آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع در پیش آئی۔ محمد (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے۔ وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا ؎

کسے کہ پنجہ زد ملک و نسب را نداند نکتۂ دین عرب را

اگر قوم از وطن بودے محمد ندادے دعوت دیں بولہب را

مقامِ محمدی اور وحدتِ عربیہ

حضور رسالت مآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو۔ ہم اپنی خداپرستی پر قائم رہتے

ہیں۔ مگر اس نسلی اور وضعی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے لیکن اگر حضور نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی نبی آخر الزماں کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ۔ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں۔

اسلام کا بے مثال کارنامہ

مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اسلام نے اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، قومی اور لسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام تیرہ سو سال میں کیا ہے۔ وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوعِ انسان پر اور اس نیت کی ہمہ گیری پر جس کے قلبِ ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

نظریۂ وطنیت کی ذہنی افتاد

مولانا حسین احمد کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے میرا احسان سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر مؤسس ہے۔ بہت سے مسلمانوں کے لئے تعجب خیز ہوگا لیکن میرے لئے چنداں تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ معصیت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ نظریہ غالب آ جائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت سے قدرتاً ذہن حرکت کرتے ہیں۔ اس خیال کی طرف کہ بنی نوعِ انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی اتحاد امکان سے خارج ہے۔ اس دوسری گمراہی سے جو وطنیت سے پیدا ہوتی ہے" ادیان کی اضافیت کی لعنت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر ملک کا دین اس ملک کے لئے خاص ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ اس تیسری گمراہی کا نتیجہ سوائے لادینی اور دہریت کے اور کچھ نہیں۔

"شرفِ انسانی" کا مفہوم

یہ ہے نفسیاتی تجزیہ اس تیرہ بخت مسلمان کا جو اس روحانی جذام میں گرفتار ہو جائے۔ باقی رہا نص کا معاملہ میں سمجھتا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کے لئے نص ہے۔ الفاظ شرفِ انسانی کے

متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے اسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو فطرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا مخصوص ہے۔ اس ترتیب پر جو توحید الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزیوں کا۔ خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مستقیم ہو۔ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمت للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ [illegible] فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو "امۃ مسلمۃ لک" کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر "شہداء علی الناس" کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔

قادیانی نبوت اور نظریۂ وطنیت

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؒ یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکار خاتمیت" کا نظریہ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانون الٰہی ابد الآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ یعنیہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی "انکار خاتمیت" الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے جس کی توضیح صرف اسی وقت ہو سکیگی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مورخ ہندی مسلمانوں اور بالخصوص ان کے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔

خاقانی کی صدائے بازگشت

اس مضمون کو میں خاقانی کے ان دو شعروں پر ختم کرتا ہوں جن میں اس نے اپنے ان معاصر حکماء اسلام کو مخاطب کیا ہے جو حقائق اسلامیہ کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں بیان کرنا فضل و کمال کی انتہا سمجھتے تھے۔ تھوڑے سے معنوی تغیر کے ساتھ یہ اشعار آج کل کے مسلمان سیاسی مفکرین پر بھی صادق آتے ہیں۔

مرکب دیں کہ زادۂ عرب است　　داغ یونانش بر کفل منہید

مشتے اطفال نو تعلم را　　لوح ادبار در بغل منہید

لاہور سے ہر قسم کی علمی۔ ادبی۔ دینی کتابیں منگانے کے لئے مکتبہ طلوع اسلام ۲۴ بی شاہ عالم مارکیٹ کو ایک کارڈ لکھ دیجئے

لغات القرآن

(جلد اوّل)

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا شاہکار

جس کا برسوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

قرآن کے الفاظ ــــ قرآن کے تصورات ــــ قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اول میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں، جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکیں گے۔

جن احباب نے یہ علم افروز کتاب حاصل نہیں کی۔ وہ اسے جلد حاصل کر لیں۔ کیونکہ ایسی نادر کتب بار بار طبع نہیں ہوتیں!

ٹائپ کی حسین و دلآویز طباعت ــــ بہترین سفید کاغذ ــــ پائیدار سنہری دیدہ زیب جلد!

قیمت ــــ پندرہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوع اسلام ۲۷۔بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

سرسید احمد خاںؒ

— ۶ —

ایک باغ و بہار شخصیت

(فطرت کا سرودِ ازلی جس کے شب و روز)

★ — (محترم صفدر سلیمی صاحب)

سلسلۂ تعارف کی اس آخری کڑی پر حیات سرسید کی ان تعارفی تفاصیل کا اختتام ہو رہا ہے جو پچھلے چند ماہ میں تسلسل کے ساتھ قارئین کے سامنے آ رہی تھیں ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ہم مطمئن اور مسرور ہیں کہ ہماری اس کوشش ناتمام نے وقت کے ایک اہم تقاضے کی بجا آوری کا سامان پیدا کیا۔ گھناؤنی مخالفت کے بہت سے گرد و غبار ڈھل گئے اور ہماری صبح انقلاب کا وہ درخشندہ ستارا منظر اشاعت پر آگیا جس کی تابانیوں سے مایوسی اور شکست کی تاریک راہوں میں نشاۃ ثانیہ کی سینکڑوں کرنیں جگمگا اٹھی تھیں اور بہت سے سہلانے خواب محسوس و مشہود اور زندہ و پائندہ حقائق میں تبدیل ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ سرسید کے جانشین آج پہلی بار خود فراموشیوں کے شبستانوں سے انگڑائیاں لے کر اٹھ رہے ہیں، اور اس عزم صمیم سے مالا مال ہیں کہ اس سرزمین میں علی گڈھ تحریک کے احیاء کے سامان پیدا کریں اور اس مملکت کی تعمیری امنگوں کو اس روحِ انقلاب سے مالا مال کر دیں جس کی تڑپ اور خلش سے ایک صدی قبل علی گڈھ کے ویرانوں میں زندگی سے بھرپور ہنگاموں نے کروٹ لی تھی اور ذوقِ انقلاب کی ان حیات آفریں لہروں نے اس برصغیر کے آخری گوشوں تک سب کے قلب و نظر کو متاثر کیا تھا۔

اس سلسلۂ تعارف سے کسی حلقہ میں یہ تاثر پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ "طلوعِ اسلام" شخصیت پرستی کے کسی مسلک کو کبھی قبول کر سکتا ہے۔ اس کے کالموں میں کسی شخصیت کا تعارف شخصیت پرستی کی روش کے تحت قطعاً نہیں بلکہ یہ نقاب کشائی ہے تاریخ کی ایک اٹل حقیقت کی جو شخصیت کے بجائے قومی نفسیات کی ترجمان ہے۔ ہمارے نزدیک سرسید کی داستان ایک شخصیت کی داستان نہیں بلکہ یہ تاریخ ہے ایک قوم کی بازآفرینیوں کی۔ یہ تذکرہ ہے اس ملت کا جس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اور وہ بسترِ مرگ پر گویا آخری ہچکیاں لے رہی تھی کہ سرسید ایسا مسیحا نفس قلندرانہ انداز سے میدان میں نکلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اُسے حیاتِ نو کے ممکنات سے بہرہ ور کر دیا بلکہ زوال اور شکست کے اندھیروں میں عروج و اقبال اور فتح و کامرانی کے چراغ بھی روشن کر دیئے۔

سرسید کے مسلم معاصرین میں علامہ جمال الدین افغانی ایسے رہنما بھی ملیں گے جو خلوص و ایثار کے [illegible] شاید سرسید سے بھی چند قدم آگے ہوں، لیکن چونکہ اُن کے جوششِ کردار میں حقائق سے زیادہ جذبات کی آگ شعلہ زن تھی اس لئے نتائج کے اعتبار سے ان کی جدوجہد کو وہ تعمیری مقام حاصل نہ ہو سکا جو تاریخ میں اپنے مستقل اثرات مرتب کرے اور ان کے نقوشِ قدم ایک قوم کے طولانی سفر میں نشانِ منزل کی حیثیت اختیار کر جائیں۔ تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ سرسید نے اپنے جذبات کو کبھی حقائق کی گرفت سے بے لگام نہیں ہونے دیا۔ اور اسی حقیقت پسندی کے باعث اس نے قوم کے لئے جس منزل کا انتخاب کیا وہ (اپنوں کی تند و تیز مخالفت کے باوجود) کاروانِ ملت کی منزل قرار پا گئی۔ اس کی موت کے بعد بھی اس منزل پر قوم کے قدم برابر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے اور آج بھی برابر بڑھ رہے ہیں۔ اس کی اعتدال پسندی کو طعن و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا، لیکن بالآخر اسے اپنائے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ اس کی فکری کاوشوں کا نہ صرف مضحکہ اڑایا گیا بلکہ اس کے لئے اُسے دہریہ، نیچری، کرسٹان، کافر اور واجب القتل ہونے کی سندیں عطا کی گئیں، لیکن کون ہے جو آج اس حقیقت سے انکار کی جرأت کر سکے کہ ان کی ان جرأت مندانہ کاوشوں سے فکر و اجتہاد کے دروازے کھل گئے اور اس کے بعد ہمارے اجتہادی سرمائے میں وہ بیش بہا اضافہ ہوتا چلا گیا جس کی مثال صدیوں سے ناپید تھی۔ ان کے قائم کردہ دارالعلوم کو کفر و الحاد کا سرچشمہ قرار دیا گیا لیکن کون انکار کرے گا کہ یہی "سرچشمہ الحاد" قومی لیڈرشپ کی تربیت گاہ اور پوری ملت کی وحدتِ فکر و عمل کا مرکز ثابت ہوا۔ اور قومی بیداری اور ذوقِ سفر کی تمام لہریں یہیں سے اُبھر ابھر کر برصغیر ہند کے آخری گوشوں تک پہنچیں۔ ان کا فیصلہ تھا کہ اپنے آئیڈیالوجیکل تضاد کے باعث ہندو اور مسلمان "برادرانِ وطن" ہوتے ہوئے بھی زندگی کی شاہراہِ عظیم پر دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اُن کے اس فیصلے کو غلط ثابت کرنے کے لئے بڑے بڑے امام الہند اور شیخ الہند میدان میں اترے لیکن برصغیر ہند کی نصف صدی کی تاریخ شہادت دے رہی ہے اور مورخ کو تاریخ کے صفحات پر لکھنا پڑا کہ سرسید کا فیصلہ تقدیر کا فیصلہ تھا اور شیوخِ ملت کا تقدس، ان کی ساحرانہ نگارش و خطابت، ان کے متحدہ قومیت کے مقدس نعرے، ان کی ہوش ربا قربانیاں، کانگریس کی مسندِ قیادت پر ان کی صدارتی نمائشیں، الغرض ان کی بساطِ سیاست کی ساری نقش گری

اور دکنی، قومی تقدیر اور ملکی تاریخ کی بارگاہوں میں گردِ راہ سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکی۔ اور جس راہ پر سرسید نے اسّی برس پہلے قدم اٹھایا تھا وہی راہ بالآخر متحدہ ہندوستان کی دو عظیم قوموں کی منزلِ مقصود قرار پائی۔ غور فرمایئے کہ اس کی مومنانہ فراست نے ۱۸۶۷ء میں کس یقین و اعتماد سے یہ کہا تھا کہ

> میرا یقین ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی مقام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا۔ یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب ابھرے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا۔ وہ دیکھے گا۔

اور پھر سوچئے کہ ٹھیک اسّی برس بعد (۱۹۴۷ء میں) تاریخ کی نگاہوں نے کس طرح دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوتے پایا۔ لاکھوں انسانوں کے خون کی ندیوں نے اسّی برس قبل کی ان دور اندیشیوں کی صداقت کی پکار پکار کر شہادت دی۔ دونوں قوموں کے نمائندوں نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور جو زندہ تھے انھوں نے اپنی آنکھوں سے بعینہٖ وہ کچھ دیکھ لیا جو سرسید مستقبل کے دھندلکوں میں ایک صدی قبل دیکھ رہے تھے۔

یہ ہے قیادت کا وہ بلند و بالا مقام جہاں ایک شخصیت پوری قوم کا عکسِ جمیل بن جاتی ہے۔ اس کی روح پوری قوم کی نفسیات کو اپنی گہرائیوں میں سمو لیتی ہے۔ اور اس کے دل کی دھڑکنیں افرادِ ملت کے قلب و نظر میں انقلابِ حیات کی اذانیں بن کر گونجنے لگتی ہیں۔ سرسید کی شخصی عظمت کا یہی وہ مقام ہے جو ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں ان کے شاہکاروں کی تفصیل کے بعد اب ہم ان کی شخصیت کے ان تابندہ نقوش کو قارئین کے سامنے لائیں جن کے امتزاج و ائتلاف سے ایک شخصیت کا پیکر تکمیل پاتا ہے۔ یہ باب اس زعیم کے اخلاق و خصائل اور شخصی اوصاف و کمالات پر مشتمل ہے۔ بعض لوگ اسے "پرائیویٹ زندگی کے شب و روز" سے یاد کریں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک حیاتِ سرسید کے کسی حصے کو ان کی "پرائیویٹ زندگی" سے معنون کرنا ان کے حقیقی مقام سے بے اعتنائی کے مترادف ہوگا۔ اس قسم کی زندگی میں جس کا ایک عکسِ جمیل ہم نے ابھی ابھی پیش کیا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا ہوتا ہی نہیں جسے پرائیویٹ کہا جا سکے۔ اس کے ذوق عمل کی گردشیں تو درکنار، اس کے دل کی دھڑکنیں اور نگاہ کی جنبشیں تک قومی اور اجتماعی کردار کا سرمایہ قرار پا جاتی ہیں۔ وہ بحالتِ خواب بھی قوم کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اور اس کے گوشۂ راحت کی کروٹوں میں بھی گویا پوری قوم کی تقدیر انگڑائیاں لیتی ہے۔ اس لئے ان کی شخصیت کے جن نقوش کا تذکرہ ہم اب شروع کر رہے ہیں انھیں "پرائیویٹ زندگی" نہیں سمجھنا چاہیئے یہی ظاہری طور پر بکھری بکھری پتیاں اور پھول ہی تو ہیں جن سے ان کی قومی سیرت کا گلدستہ ترتیب پایا۔

خاندانی کوائف

سرسید کے آباؤ اجداد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ہرات سے آئے اور دلی میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے دادا سید ہادی کو عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کے درباروں میں ممتاز مقام حاصل تھا اور جلال الدولہ کے خطاب کے علاوہ صوبہ شاہجہاں آباد کے عہدۂ احتساب اور عہدۂ قضائے لشکر پر سرفراز تھے۔

انھیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور ان کا قلمی دیوان جو بغاوت ہند کے حادثوں میں تلف ہو گیا سنہ ۱۸۵۷ء تک سرسید کے پاس موجود تھا۔ جواد الدولہ کی وفات کے بعد سرسید کے والد میر متقی کو بھی شاہ عالم کے دربار میں وہی مناصب حاصل رہے۔ لیکن ایک آزاد طبع اور صوفی مشرب ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ شاہی دربار کی شرکت سے ابا کرتے تھے۔ انھیں اس دور کے ایک مشہور صوفی بزرگ شاہ غلام علی سے ارادت تھی اور بالآخر انھیں کی پائنتی میں مدفون ہوئے۔

سرسید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ بڑے با اقبال اور صاحب علم و فضل شخصیت گذرے ہیں۔ بالخصوص علوم ریاضیات میں انھیں وحید العصر ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے مصاحب خاص بھی رہے ہیں۔ اور پھر لارڈ ولزلی کی حکومت نے انھیں ایران میں منصب سفارت پر فائز کر کے بھی بھیجا۔ ازاں بعد وہ اکبر شاہ ثانی کے منصب وزارت پر متمکن ہوئے۔ لیکن مالیات میں ان کے اصلاحی اقدام سے شاہی خاندان کے افراد میں ناراضگی پھیل گئی اور وہ اس عہدہ سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بار بار انھیں اہم مناصب کی پیشکش کی لیکن وہ ہمیشہ اس پیشکش کو مسترد کرتے رہے۔

بچپن کے شب و روز سرسید کی ابتدائی تربیت اپنی والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد کی یہ دختر ملبند اختر جن کی آغوش لطف و مرحمت میں سرسید نے تربیت پائی، عام خواتین کے مقابلہ میں نمایاں خوبیوں اور صلاحیتوں سے ممتاز تھیں۔ ان کی دور بینی اور دانش وری خواتین میں ضرب المثل تھی اور اولاد کی تربیت کے معاملے میں تو انھیں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ وہ غریب اور پردہ نشین عورتوں کی امداد کے طور پر صرف کرتی تھیں۔ سرسید نے ابتدائی تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔ تربیتی نقطہ نظر سے انھوں نے سرسید پر گھر سے باہر نکلنے کے معاملہ میں بہت سی پابندیاں عاید کر رکھی تھیں۔ لیکن سرسید کی طبع آزاد ان پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور وہ اپنے نانا جان کی وسیع حویلی میں ماموں زاد بھائیوں سے ہر قسم کی کھیلوں میں سرگرم کار رہتے تھے اور جن مشغلوں سے اس دور زوال کے رئیس زادوں کی دلچسپیاں قائم تھیں۔ ان میں سرسید کا کسی دوسرے سے کم حصہ نہیں تھا۔ گنید بلا، کبڈی، آنکھ مچولی۔ کبوتر بازی۔ تیراکی۔ پتنگ بازی سب کھیلوں میں سرسید کی شوخیاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ان کی نت نئی شرارتوں نے چھوٹوں اور بڑوں سب کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی نے صاف لکھا ہے کہ جب بھی ان کے سوانح حیات مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا وہ جواباً کہا کرتے تھے کہ

> میری لائف میں سوائے اس کے رکھا ہی کیا ہے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے۔

عنفوان شباب کھیل کود اور شوخی و شرارت کی ان جولانیوں میں انھوں نے جب وادی شباب میں قدم رکھا تو زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور رنگین طبعی انھیں اپنے جلو میں لئے آگے بڑھی۔

ان کی اٹھتی جوانی۔ امنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کا عنوان بن گئی۔ ان کے شب و روز رنگین صحبتوں میں گذرنے لگے۔ راگ رنگ کی مجلسیں ان کے لئے وجۂ نشاط بن گئیں۔ اور رقص و سرود کے شبستانوں نے اپنی کیف انگیزیوں سے ان کے دل کو برمانا شروع کر دیا۔

اپنی تحریروں میں سرسید نے جوانی کی ان لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی زہد و پارسائی کا کوئی دعویٰ کیا۔ جہاں بھی وہ اس دور کی قومی عیاشیوں کا تذکرہ چھیڑتے اپنی ذاتی رنگین مزاجیوں پر سے بھی سارے نقاب الٹ دیتے اور بلا کم و کاست سب کچھ بھی بیان کر جاتے۔ چنانچہ قوم کی غفلتوں، عشرت پسندیوں اور تن آسانیوں کے تذکرے کے بعد ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ

> ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا عادات ہماری قوم کی ہیں جو ہم میں نہیں تھیں۔ کون کون سی کالی گھٹائیں تھیں جو ہماری قوم پر چھا رہی تھیں اور ہم پر نہ چھائی ہوں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔ جب زاہد خشک ہوئے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے اور اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار۔

ایک نیا موڑ

سرسید کے بچپن اور ابتدائے شباب کی ان سرمستیوں کو دیکھ کر کسی شخص کے لئے بھی یہ باور کرنا ممکن نہیں ہوگا کہ ایسا کھلنڈرا اور رنگین مزاج نوجوان ایک قریب المرگ قوم کی مسیحائی کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ معجزہ نمودار ہوا اور تاریخ میں وہ دن طلوع ہو کر رہا جب زمانے کی نگاہوں نے اس نوجوان کو امام انقلاب بن کر میدانِ تگ و تاز میں کودتے اور قومی موت کو زندگی سے بدلتے پایا۔ سرسید کو اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ سید محمد خاں کا تو قول تھا کہ کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید احمد وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔" یہی کیفیت سرسید کی تھی۔

اچانک سید محمد خاں کی موت کا حادثہ برپا ہوا۔ یہ حادثہ ایک بجلی تھی جو رنگین مزاج سرسید کے ولولہ ہائے شوق پر گری۔ محبوب ترین بھائی کی موت نے ان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے راگ رنگ کی محفلوں اور رقص و سرود کی رنگین محفلوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ لاابالیت کے بجائے اب ان کے دل و دماغ پر متانت اور سنجیدگی کی کیفیت ابھر آئی۔ اور اس زخم نے انھیں ایسے درد و سوز اور تڑپ و خلش سے آشنا کر دیا جو آہستہ آہستہ ان کے قومی جذبات و حسیات میں سمو لے گئی۔

شکل و شمائل

سرسید ایک دراز قامت اور سرخ و سپید رنگ کے انسان تھے۔ بلند پیشانی۔ عقابی نگاہیں۔ چہرے پر بے مثال دلکشی اور وجاہت ٹپکتی تھی۔ بھری بھری اور طویل ڈاڑھی نے اس وجاہت کو مزید

پُرجلال بنا دیا تھا۔ اس جاہ و جلال کے ساتھ زندہ دلگشی اور گرمجوشی کے امتزاج نے ان کی شکل و شباہت کو بڑا پُراثر بنا دیا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی ہر شخص پر ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا تھا اور اس کا دل بے ساختہ ان کی عظیم شخصیت کی شہادت دیتا تھا۔ ایک جہانگیر قوم کے افراد ہونے کی نفسیات سے انگریز عام طور پر کسی شخصیت اور اس کی وجاہت سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن سرسید کی وجاہت اس قدر اثر انگیز اور پُرکشش تھی کہ بڑے بڑے انگریز دیر تک ان کے چہرے پر ٹکٹکی لگائے رہتے تھے اور ان کی اس کیفیت میں بڑے ہی تاثر اور تعجب کا احساس موجزن ہوتا تھا۔

اوضاع و عادات

سرسید کے اوضاع و اطوار انتہائی سادگی اور بے ساختگی کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ رکھ رکھاؤ اور تصنع ان سے کوسوں دور تھا۔ یہ سادگی ان کے اندازِ گفتار میں بھی نمایاں تھی۔ انکی گفتگو بڑی ہی سیدھی سادی، تکلفات سے پاک عام فہم اور دل نشیں ہوتی تھی۔ دوسروں کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لئے وہ کبھی پُرتکلف علمی انداز اختیار نہیں کرتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ تک دلی کا سا تھا۔ بڑے آہستہ آہستہ بولتے تھے اور بلا ضرورت گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔

انھوں نے عازمِ انگلستان ہونے پر پہلی بار ترکی لباس اختیار کیا۔ اور پھر تاحینِ حیات نہ صرف اسے خود اختیار کئے رکھا بلکہ اسے مسلمانوں کے قومی لباس کی حیثیت دینے کی سعی کی۔ ترکی لباس اختیار کرنے سے بہت قبل انھوں نے یورپی طرز بود و باش اپنائی تھی۔ وہ بنگلے میں رہتے، میز کرسی لگا کر کھانا کھاتے اور چھری کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ قومی قیادت کے مدعی بن کر یہ راہ اختیار کرنا ـــــ اور پھر قدامت پرستی کے اس دور میں ـــــ بڑا ہی دل گردے کا کام تھا۔ لیکن سرسید کا سب سے بڑا کمال یہی تو تھا کہ وہ ہر معاملہ میں مسلکِ تقلید سے بالاتر ہو کر فیصلہ کرتے تھے۔ اور پھر جس راہ کو درست قرار دے دیتے ہر طعن و تشنیع سے بے نیاز رہ کر بے دھڑکے اس پر گامزن ہو جاتے تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ بود و باش تک میں قدامت پسندی ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑے گی اور ترقی کی ہر منزل پر سنگِ راہ بن جائے گی تو انھوں نے حالات کے تقاضوں کے تحت جہاں زندگی کے کئی ایک دیگر گوشوں میں انقلاب پیدا کیا وہاں بود و باش میں بھی یہ تبدیلی ضروری سمجھی۔ ترکی اور مصر جیسے مسلم ممالک پہلے سے یہ راہ اختیار کر چکے تھے۔ خدا کا دین اس معاملہ میں کوئی پابندیاں عائد نہیں کرتا۔ تو پھر سرسید جیسا انقلاب پسند ان رسمی معاملات کو قدامت پسند بنکر کیوں قبول کئے رکھتا۔ جبکہ حالات اُسے اس فیصلہ پر پہنچا چکے تھے کہ مسلمانوں کے زوال اور شکست کا محرک مخالفوں سے زیادہ خود ان کی اپنی کم نگہی، تنگ ظرفی، قدامت پرستی اور تقلیدی روش ہے۔

مسکرات سے پرہیز

سرسید نے زندگی بھر کبھی منشیات کو منہ نہیں لگایا۔ شدید بیماری میں جب دوا کے طور پر بھی ڈاکٹروں نے کبھی کوئی ہلکی سی شراب تجویز کی تو پینے سے صاف انکار کر دیا۔ انگلستان کی بڑی بڑی شاہانہ دعوتوں میں جہاں شراب ضیافتوں کا لازمی جزو سمجھی جاتی ہے وہ ہمیشہ اس سے

اجتناب کرتے رہے۔ اگر ڈیوک آف آرگائل جیسے ممتاز اور مقتدر احباب نے زیادہ تقاضا کیا تو صاف کہہ دیا کریں "نوح کی شراب" نہیں پیتا۔ آدم کی شراب (پانی) پیتا ہوں۔ (اس میں محرف توراۃ کے بیان کی طرف اشارہ تھا)۔

مہمان نوازی

مہمان نوازی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ تحریک علی گڑھ کے دوران میں تو ان کا گھر مہمان سرا بن گیا تھا۔ اور مہمانوں کی کثرت کے باعث وہ اکتانے کی بجائے زیادہ خوش ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں وہ عید کی سی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ ان کا دسترخوان احباب سے بہت کم خالی ہوتا تھا اور جس دن کوئی مہمان نہ ہو دسترخوان پر بیٹھتے وقت ان کے چہرے پر بشاشت کے بجائے افسردگی سی طاری ہوتی تھی۔ رات کا دسترخوان بڑی ہی پرلطف مجلس کا رنگ پیش کرتا تھا۔ اس مجلس میں بڑے بڑے علمی، تاریخی سیاسی اور مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ طنز و مزاح اور دل لگی کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کھانے تعداد و اقسام کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی ہوتا تھا خوب عمدہ ہوتا تھا۔ ذاتی طور پر سرسید کو ترکاریاں اور پھلوں میں آم و خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ کھانے کے بعد دودھ بلاناغہ پیتے تھے۔ حقہ نوشی کی بھی بہت عادت تھی۔ لیکن ولایت جانے کے بعد سگریٹ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

جفاکشی

سرسید کی عظیم کامرانیوں اور فتحمندیوں کا راز ان کی ان تھک فکری کاوشوں، شبانہ روز محنت اور عزم و استقلال میں پوشیدہ ہے۔ محنت اور جفاکشی ابتدائے شباب سے ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ شام تک عدالت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے اور رات کے کھانے کے بعد نماز عشاء سے فارغ ہو کر بستر پر چلے جاتے۔ اور زیادہ سے زیادہ تین ساڑھے تین گھنٹے تک نیند پوری کر لیتے۔ پھر وہ بلاناغہ اٹھ بیٹھتے اور صبح تک مطالعہ میں مشغول رہتے۔ محنت شاقہ کا یہ سلسلہ ساری زندگی جاری رہا۔ خطبات احمدیہ جیسی اہم تصانیف کے سلسلہ میں تو ان کی محنت محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ مسلسل تحریری کام جاری رکھنے سے ان کے پاؤں اور پنڈلیاں سوج جاتیں اور اس کا درد مہینوں باقی رہتا۔ دارالعلوم علی گڑھ کی تعمیرات کے سلسلے میں شدت گرما میں وہ سارا سارا دن تیز دھوپ میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتے اور ادنیٰ تھکان یا تکلیف محسوس نہ کرتے۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ دارالعلوم کی ذمہ داریوں اور دیگر سینکڑوں فرائض کا سلسلۂ دراز، سرسید ساتھ ساتھ سب امور کی سرانجام دہی میں مصروف کار رہتے تھے۔ ان لاتعداد کاموں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک لشکر کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سرسید کی تن تنہا جان تھی جو ایک لشکر کا کام حسن و خوبی سے پورا کئے جا رہی تھی اور اس کی رفتار میں کہیں ادنیٰ رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کتابیں بھی لکھی جاری تھیں ان کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عظیم الشان عمارتوں کا سلسلۂ تعمیر بھی ترقی پذیر تھا۔ بجٹ بھی تیار ہو رہے تھے۔ سالانہ رپورٹیں اور خطبات بھی مکمل ہو رہے تھے۔ پولیٹیکل میدانوں میں مخالفین سے مقابلہ بھی کامیابی کے ساتھ جاری تھا۔ اس کے علاوہ اور کتنے کام تھے جو اس ایک شخص کی شب و روز کی جان توڑ محنت سے حسن کارانہ انداز سے تکمیل پذیر

ہو رہے تھے۔ وہ کبھی اس محنتِ شاقہ سے تھکتے نہیں تھے۔ اور اگر کبھی کام کرتے کرتے غنودگی طاری ہو جاتی تو وہیں اپنی نشست گاہ میں کسی کرسی یا تکیہ کے سہارے تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کر لیتے تھے۔

ظرافتِ طبع

لیکن شب و روز کی ان مسلسل عرق ریزیوں، دماغ سوزیوں اور جگر کاویوں میں ان کی ضیافتِ طبع اور تر و تازگی کا سامان ان کی طبعی ظرافت اور شگفتگی میں مضمر تھا۔ یہی شوخیٔ طبع تھی جس نے بڑھاپے تک انھیں کھلائے رکھا۔ اور تھکن کے آثار ان کے قریب نہ آنے دیئے۔ سرسید کے ہزاروں چٹکلے مشہور ہیں اور اگر انھیں اکھا کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ان کی ظرافتِ طبع کی ایک مثال سنیئے۔

تہذیب الاخلاق میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا جس میں انھوں نے لکھا کہ جیسا اہل سنت سمجھتے ہیں، اجماع کو حجتِ شرعی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ بنارس کے ایک سید صاحب نے جو شیعہ مذہب رکھتے تھے جب یہ مقالہ پڑھا تو بڑے خوش ہوئے اور اسی خوشی کے عالم میں سرسید سے ملاقات کے دوران میں یہ سوال کر ڈالا کہ "کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع، حجتِ شرعی نہیں تو پھر خلیفہ اول (صدیق اکبرؓ) کی خلافت کیونکر جائز ثابت ہوگی؟" سرسید نے فوراً جواب دیا۔

"حضرت! نہ ہوگی تو ان کی نہ ہوگی۔ میرا اس سے کیا بگڑے گا!" شیعہ حضرت یہ سن کر اور بھی خوش ہوئے اور یہ سمجھے کہ میں میدان مار لیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد پھر گویا ہوئے کہ "کیوں جناب! اس اختلاف میں جبکہ کچھ لوگ خلیفہ اول کے حق میں تھے اور کچھ جناب امیرؓ کے حق میں، اگر آپ اس وقت موجود ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟" اور سرسید نے بے ساختہ کہا۔ "حضرت مجھے کیا ضرورت تھی کسی کے لئے کوشش کرنے کی۔ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کے لئے دھول پیٹتا اور سُو سُو ئے کامیاب ہوتا۔" یہ سننا تھا کہ وہ شیعہ بزرگ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ جوتیاں پہنیں اور گھر کی راہ لی۔

اسی طرح ریل کے ایک سفر میں دو پادریوں سے ملاقات ہو گئی۔ سرسید کے نام کی شہرت تو تھی ہی۔ چنانچہ تعارف سے بڑے خوش ہوئے۔ دوران میں سے ایک نے کہا۔

"مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ آپ سے خدا کی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

یہ سنتے ہی سرسید کی ظرافتِ طبع پھڑک اٹھی۔ چنانچہ بڑے انجان بن کر کہا۔

"میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں!"

"خدا کی باتیں جناب!" اس نے جواباً کہا

اب سرسید ظاہراً کچھ سنجیدہ سے ہو گئے اور کہا۔ "میری تو کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے میں ان کو نہیں جانتا۔" پادری صاحب اس پر بڑے متعجب ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے؟" سرسید نے کہا۔ "بھلا پرکیا موقوف ہے جناب! جس سے ملاقات نہ ہو اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا۔ "آپ اسے جانتے ہیں؟" پادری نے جواب دیا۔ "نہیں میں انھیں کبھی نہیں ملا۔" اب سرسید گویا ہوئے۔ "پھر جس شخص سے آپ کبھی نہ ملا ہوں۔ نہ میں نے

کبھی اس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھے کبھی اس کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ہو، اس کو میں کیونکر جان سکتا ہوں۔" بیچارہ پادری یہ سنکر خاموش ہو گیا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہنے لگا۔ "یہ شخص تو سخت کافر ہے۔"

مطالعہ و تصنیف میں جذب و انہماک

سرسید کے وقت کا کافی حصہ مطالعہ میں گذرتا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی کتاب کو دلبستگی یا لطف اندوزی کے احساس سے نہیں پڑھا بلکہ مطالعہ کے دوران میں ان کا فکری تجسس مصنف کے خیالات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ دورانِ مطالعہ میں ان کا جذب و انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نفسِ تحریر میں اس حد تک کھو جاتے تھے کہ بعض قریب بیٹھے ہوئے نو وارد لوگ اسے غرور پر محمول کرنے لگتے۔

جذب و انہماک کی یہی کیفیت تحریر کے دوران میں پائی جاتی تھی۔ جب کوئی قابلِ غور مرحلہ آجاتا تو چاہے خلوت میں ہوں یا احباب کے جھرمٹ میں وہ غور و فکر میں اس حد تک ڈوب جاتے تھے کہ انھیں کسی اور چیز کی خبر اور احساس تک نہیں رہتا تھا۔ دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہتے اور جونہی تہہ تک پہنچ گئے اور گوہرِ مقصود پالیا تو ان کے چہرے پر بشاشت اور شگفتگی کی لہریں ابھر آتی تھیں اور وہ فرطِ مسرت سے جھومنے لگ جاتے تھے۔

اخلاق و خصائل

سرسید کی جامع الصفات شخصیت عظیم اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھی۔ پرنسپل بک نے ان کی وفات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی عظمت پر تحسین کے سلسلہ میں بڑے جامع الفاظ استعمال کئے تھے اور سرسید کے اخلاق و اوصاف کو ایک فقرہ میں سمو دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ

> اس کی صلاحیتیں بہت بڑی تھیں لیکن اس کے اخلاق ان سے بھی عظیم تر تھے۔

بالفاظ دیگر پرنسپل بک کے الفاظ کا مفہوم یہ تھا کہ سرسید اعلیٰ دل و دماغ کے مالک تھے۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ ان کی ذات کو زیادہ نشوونما حاصل تھا یا طبعی کمالات کو۔ وہ عقل میں ممتاز تھے یا نیکی میں۔ انھوں نے کم و بیش زندگی کے ساٹھ برس قومی خدمت کے میدان میں بسر کئے۔ ملک کے طول و عرض میں ان کے بدترین مخالف پھیلے پڑے تھے۔ ایک زمانہ شب و روز ان کی عیب جوئی کی گھات میں لگا رہا۔ ان کے دوستوں اور دشمنوں کو ان کی زندگی کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لینے کے کھلے مواقع حاصل تھے۔ لیکن ساٹھ برس کی اس طویل مدت میں ان کے بے داغ کردار پر ادنیٰ حرف گیری ممکن نہ ہوئی۔ مخالف انھیں کافر، ملحد، بے دین، دہریہ، عیسائی اور کرسٹان کے خطابات سے تو نوازتے اور اس طرح اپنا دل ٹھنڈا کرتے رہے۔ لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس کی اخلاقی پاکیزگی پر انگلی اٹھا سکے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس مرحلہ پر ان کی اخلاقی عظمت کے چند پہلو قارئین کے سامنے لائیں۔

حق گوئی و بے باکی

صداقت شعاری سرسید کے اخلاق کا ممتاز ترین پہلو ہے۔ بڑی بڑی نامور شخصیتوں میں یہ

کمزوری نظر آئے گی کہ بدنامی اور ملامت کے خوف سے انھوں نے اکثر معاملات میں مصلحت کوشیوں کی راہ اختیار کی اور جہاں عوام کی مخالفت کا خطرہ نظر آیا راست بازی سے کام لینے کی بجائے صاف طرح دے گئے۔ لیکن جہاں تک سرسید کا تعلق ہے وہ حق گوئی و بے باکی کے اس بلند مقام پر فائز تھے۔ جہاں بڑے سے بڑا خوف اور بڑی سے بڑی مخالفت انھیں اس راہ پر قدم بڑھانے سے نہ روک سکی جسے انھوں نے درست سمجھ لیا۔ ان کی اسی خوبی نے ایک دنیا کو ان کی مخالفت میں لا کھڑا کیا۔ انھوں نے گالیاں کھائیں۔ کفر کے فتوے قبول کئے۔ لیکن کبھی مصلحت کی راہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ مسلک تقلید سے روگردانی اختیار کر کے انھوں نے آزادیٔ فکر کا جو شعار اپنایا اور ان کی تحریریں اسی رنگ میں رنگی گئیں تو ایک زمانہ انکی مخالفت میں کمربستہ ہو گیا۔ لیکن سرسید کا قلم ایک لمحہ کے لئے بھی سچائی کے اس مسلک سے گریز کی راہیں اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اردو لٹریچر اور بالخصوص اردو صحافت میں سچائی اور آزادی کی اساس سرسید ہی کے قلم سے قائم ہوئی۔ اور حق گوئی و بے باکی کی یہ طرح انہی نے ڈالی۔

اسی راستبازی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہر بڑے سے بڑے الزام کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے لیکن یہ گوارا کرنے کو کبھی تیار نہ ہوئے کہ ان کی صداقت شعاری کے خلاف بہتان طرازی سے کام لیا جائے۔ گویا سچائی ان کا مذہب بھی تھا اور ایمان بھی۔ انھوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ تہذیب الاخلاق میں کوئی ایسا مضمون شائع نہیں ہو سکے گا جس کے رقم تحریر اپنا نام چھپائیں۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عوام میں اپنے خیالات کے کھلم کھلا اظہار کی جرأت پیدا ہوئی۔ سچائی کا ساتھ دینا ان کے نزدیک ایمان کی اساس تھی۔ چنانچہ ایک بار ان کے ایک عزیز اور مخلص دوست کو (غالباً نواب وقار الملک کا ذکر ہے) ایسے عیسائی افسر سے سابقہ پڑا جو دفتر کے اوقات میں نماز پڑھنے پر معترض تھا۔ انھوں نے ایک خط میں اس کی اطلاع سرسید کو دی اور ان کا مشورہ طلب کیا۔ سرسید نے انتہائی غم و غصہ کے عالم میں ان کو جو جواب لکھا اس سے ان کی صداقت شعاری کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ لکھتے ہیں۔

> آج خط ملا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا۔ اور وقت بے وقت کا خیال بھی نہیں کرتا۔ دو دو گھنٹی ملا کر بھی پڑھ لیتا ہوں..... یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ لیکن تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا نہایت لچر پن کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے لیکن کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میرے نزدیک کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تراق سے استعفیٰ دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا

کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری

میسر آتی۔ فاقے سے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام

سرسید کے قیام انگلستان کے دوران کا واقعہ ہے کہ ان کی آزادانہ تحریریں ہندوستان آکر سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوتی تھیں اور ان پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع تھی کہ مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) نے ایک خط کے ذریعے اس پر اظہار افسوس کیا اور انہیں منع کیا کہ ایسی تحریریں بھیجیں جن سے مخالفت تندی و تیزی اختیار کرے۔ لیکن سرسید اسے کیونکر گوارا کرتے۔ جواباً بڑے لطیف اور طنزیہ پیرائے میں ایک خط لکھا۔ اس خط میں وہ بڑے سوز سے لکھتے ہیں۔

> افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ لکھنے نہ آتے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجئے۔ جب میں وہ لفظ لکھے۔ بایں ہمہ تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کرو گے۔ بھائی! تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں برا کروں اور اس کو اس لئے چھپاؤں کہ لوگ برا نہ کہیں؟ لیکن ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ ہوئے ہیں کہ کچھ حیلہ نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں وہ سن لیتا ہے۔ ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر۔ نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو۔

مرکز مہر و وفا

سرسید کی شخصیت، وفا و محبت کا ایک بھرپور خزانہ تھی۔ ان کی وفا و محبت کی یہ دولت نہ صرف اعزا اور احباب پر بے دریغ نچھاور ہوا کرتی تھی بلکہ مخالفوں اور دشمنوں پر بھی۔ عزیزوں سے محبت کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بھائی کی وفات کا صدمہ وہ بیس برس تک نہ بھول سکے۔ ان کی یاد آتے ہی، فسردگی اور ملال میں ڈوب جاتے تھے۔ بھائی کی اولاد کو حقیقی اولاد سے بڑھ چڑھ کر شفقت کا سہارا دیا۔ یتیم بھتیجے کو کبھی جدا نہ ہونے دیتے۔ سفر و حضر میں ساتھ رکھتے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور اپنے پلنگ پر ساتھ سلاتے تھے۔

بیگم کا انتقال ان کی جوانی ہی میں ہو گیا تھا۔ صغیر سن بچے بھی تھے جن کی پرورش کی ذمہ داری سرسید جیسے مصروف انسان کے لئے بے حد دشواری تھی۔ لیکن جب کبھی احباب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا غمناک ہو گئے اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہا "محمود کی والدہ کہاں سے ملے گی؟" والدہ سے محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار ان کی وفات کے بعد ایک پبلک اسپیچ میں مرحومہ کا ذکر آ گیا۔ معاً ان کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس بڑھاپے میں والدہ کے ذکر پر ان کی اشک آلود پلکیں لوگوں کو متعجب کر رہی تھیں۔

جہاں تک احباب کا معاملہ تھا وہ ان کی زندگی کا ایک لازمی عنصر قرار پا گئے تھے۔ زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود، دوستوں کی ملاقات ان کے لئے عید کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی خاطر اہم سے اہم کام چھوڑ بیٹھتے اور ان ملاقاتوں

سے کبھی جی نہیں اکتاتا تھا۔ ان کے خطوں کا جواب بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے اور اس معاملہ میں کبھی ادنیٰ تاخیر روا نہیں رکھتی۔ محبت کی یہی کشش تھی جو نواب محسن الملک جیسے احباب کو حیدرآباد دکن سے علی گڈھ کھینچ لائی۔ وہ وطن ملت کو چھوڑ کر علی گڈھ کے لئے وقف ہو گئے۔ اور ساری زندگی سرسید کے دست و بازو بنے رہے۔ احباب کے لئے تو ان کے قہر و غضب میں بھی جو دلکشی تھی وہ دوسروں کے لطف و کرم میں نظر نہ آتی تھی۔ نواب محسن الملک ہی کو لیجئے سرسید نے انہیں ہمیشہ عتاب آمیز خطوط ہی لکھے لیکن سرسید سے ان کا رشتہ ہمیشہ شمع و پروانہ کا سا رہا۔ انھوں نے سرسید کی رفاقت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ الہ آباد کانفرنس میں نواب موصوف نے سرسید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اشعار پڑھے تھے اور جس ذوق و وجد کے عالم میں پڑھے تھے۔ ان سے اس وابستگی اور شیفتگی کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ اشعار تھے۔

دلبرانِ ماہ پیکر دیدہ ام — در جمالت چیز دیگر دیدہ ام
تو مکمل از کمالِ کیستی؟ — مظہرِ نورِ جمالِ کیستی؟

دوستوں سے سرسید کی والہانہ اور بے پناہ محبت کو دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ زندگی کے دیگر تمام معاملات میں جہاں وہ بڑے آزاد خیال اور ترقی پسند واقع ہوئے تھے وہاں احباب سے دلبستگی کے سلسلہ میں وہ پورے کنزرویٹو (قدامت پسند) نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں سے اسی قسم کی توقعات وابستہ کئے ہوتے جیسی اگلے زمانہ کے باوضع اور باوفا دوستوں کے واقعات میں پائی جاتی ہیں۔ تحریک علی گڈھ میں جن احباب نے ان سے رفاقت کی وہ انھیں اپنے رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر عزیز اور محبوب سمجھتے تھے۔ خان بہادر ڈپٹی برکت علی خاں (لاہور) سردار محمد حیات خاں (پنجاب) قاضی رضا حسین (رئیس اعظم پٹنہ) خلیفہ محمود حسن خاں (وزیر پٹیالہ) مولوی چراغ علی اور میر نور حسین کو وہ ہمیشہ اپنے دست و بازو سمجھتے رہے اور ان کی وفات پر جس قدر رنج و ملال انھوں نے محسوس کیا کوئی دوسرا اپنے قریب ترین عزیز کے لئے کیا کرے گا۔ نواب انتصار جنگ اور نواب عماد الملک کو وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے اپنے لخت جگر سید محمود کو۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی۔ مولانا ذکاء اللہ، سید زین العابدین۔ میر تراب علی، سید مہدی علی خاں، مولوی مشتاق حسین، حاجی اسمٰعیل خاں۔ راجہ جے کشن داس، مرزا عابد علی بیگ سب ان کے مخلص ترین احباب میں سے تھے اور رفقائے سفر بھی۔ وہ ان سب پر جان چھڑکتے تھے اور یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان میں سے کسی کی کوئی غیبت یا شکوہ شکایت ان کے سامنے ہو۔ چنانچہ ایک بار جب ان سے ایک شخص نے شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی کے متعلق شکایتاً یہ کہا کہ وہ باوجود استطاعت کے دارالعلوم کی امداد نہیں کرتے تو یہ سنکر طیش میں آ گئے پہلے ان کے عطیات کی تفصیل بیان کی اور پھر کہا کہ "یہ شخص ہماری قوم کے لئے باعث فخر ہے۔ آئندہ اس کی نسبت کوئی لفظ منہ سے نہ نکالنا"

خود اعتمادی اور عزم و استقلال

سرسید کا ایک اور اہم اخلاقی کمال اپنے فیصلوں کی صداقت

پراٹل اور ناقابل شکست یقین اور اعتماد تھا۔ اور اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہی کمال تھے جن کے زیر اثر انہوں نے مشکلات و موانعات کے بڑے بڑے پہاڑوں کو شکست دی۔ ان کی زندگی کے اکثر اہم فیصلے عوام کے فہم سے بالاتر تھے۔ ان فیصلوں نے چاروں طرف مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔ لیکن اپنی رائے پر ان کا اٹل اعتماد اس مخالفت کو پرِ کاہ کے برابر خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اسی خود اعتمادی نے انہیں عزم و استقلال کی ان خوبیوں سے مالا مال کیا تھا جو کسی عظیم شخصیت کے زندۂ جاوید کارناموں کی محرک بنتی ہیں۔ اگر خود اعتمادی کی یہ دولت سرسید کے حصّہ میں نہ آتی تو مخالفت اور ملامت کے خوف سے وہ بار بار اپنے فیصلے بدلنے پر آمادہ ہو جاتے۔ مشکلات و موانعات کے مقابلہ میں ان کا عزم و استقلال قدم قدم پر ہتھیار ڈال دیتا۔ اور جن کارہائے نمایاں کی آب و تاب سے ان کی زندگی کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ وہ اسی ذہنی تزلزل میں ناکامی اور شکست کا شکار بن کر رہ جاتے۔

معاف کردو اور بھول جاؤ

اپنی ہی قوم کے افراد کے ہاتھوں سرسید کو جن گوناگوں مخالفتوں کا شکار ہونا پڑا دنیا میں اس کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔ کوئی گالی نہیں جو انہیں نہ دی گئی ہو۔ بہتان طرازی اور افترا پردازی کا کوئی تیر نہیں جس نے ان کے قومی ولولوں کو زخمی کر کے ارمان نہ پورے کئے ہوں۔ تکفیر بازی کا کوئی تند و تیز شعلہ نہ تھا جس نے ان کے دامنِ صبر و قرار کو پھونک ڈالنے کی جرأت نہ کی ہو۔ لیکن سرسید کی بردباری اور وسعتِ قلبی کے قربان جائیے کہ انہوں نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی ہمیشہ نیک دعاؤں سے یاد کیا حتیٰ کہ جن ظالموں نے انہیں خطوں میں غلیظ گالیاں اور قتل کی دھمکیاں دیں۔ اس فرشتہ سیرت کو کافر، ملحد، کرسٹان اور دجال تک کہا۔ واجب القتل قرار دیئے جانے کے فتوے حاصل کرنے حرمین شریفین تک پہونچے۔ ان کے بارے میں بھی انہوں نے علی رؤس الاشہاد اعلان کیا کہ "میں اپنے کسی مسلمان بھائی سے نہ اس دنیا میں کوئی بدلہ لینا چاہتا ہوں اور نہ قیامت میں۔ میں نہایت ناچیز ہوں مگر اس رسولؐ کی ذریت سے ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے۔ میں انہی کی راہ پر چلوں گا اور جن لوگوں نے بھی مجھے برا کہا یا اتہام لگایا۔ یا آئندہ کہیں اور کریں گے سب کو بصدقِ دل معاف کر دوں گا۔"

اکثر اخبارات میں ان کے خلاف نہایت دل آزار مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان میں انتہائی رکیک اور ناقابل برداشت الزام بازی اور طعن و تشنیع سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن سرسید ان کا کوئی نوٹس لینا تو درکنار انہیں اس رواداری سے نظر انداز کرتے اور اس قدر جلد بھول جاتے تھے گویا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ان کے عقیدت احباب جب ایسے الزامات کا جواب لکھنے پر مُصر ہوتے تو وہ انہیں سختی سے روک دیتے۔ مولوی سراج الدین نے ایک بار جب ان کی حمایت میں قلم اٹھایا تو انہوں نے ایک خط میں لکھا۔

> بلاشبہ میں آپ کی اس محبت کا جو مجھ ناچیز سے ہے ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کو اس تحریر کے لئے جو آپ کے اخبار میں ہے بوجہ جوشِ محبت کے معذور سمجھتا ہوں۔ مگر اسے چھوڑ دیجئے اور جس کا جی

چاہتا ہے کہنے دیجئے۔ ہمارا اس سے بھلا کیا بگڑتا ہے۔ اگر ہمیں برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے تو خوش ہو لینے دیجئے۔

ایک دوسرے خط میں انھیں لکھا:۔

خدا نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ برا کہنے والوں کی برائی سے ہمیں کیا کام؟ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے۔۔۔ برا کہنے والوں کی نسبت ہم کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے کی کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ وہ برائی ہم میں نہیں۔

ایک اخبار کے ایڈیٹر کو جو ان کا مداح تھا ایک شائع شدہ مضمون کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں۔ بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی جائے تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لوگ کیا کچھ نہیں لکھتے۔ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا۔؟

سرسید کی رواداری اور وسعت قلبی کی شان صرف "بھول جاؤ اور معاف کردو" کی فیاضی تک محدود نہ تھی بلکہ جو نابکار ہمیشہ ان کے درپئے آزار رہے اور جب بھی موقع ملا انھیں نقصان پہنچانے سے باز نہ آئے ان کے متعلق بھی سرسید کا حسن سلوک ایسا حیرت انگیز اور قابل تحسین تھا کہ بدترین دشمن بھی عش عش کر اٹھتا تھا۔ مراد آباد کے دفتر جج کے ایک ہندو کلرک کو ان سے خدا واسطے کا بیر تھا اور جب وہ وہاں صدر الصدور کے منصب پر متعین تھے تو وہ اکثر ان کے خلاف گمنام درخواستیں بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو عرضی لکھ بھیجی کہ صدر الصدور (سرسید) کے بھتیجے نے ایک عورت کو قتل کر دیا ہے اور لاش ان کے (سرسید) کے گھر موجود ہے۔ اسی وقت پولیس آناً فاناً سرسید کے مکان پر چڑھ دوڑی۔ مکان بے پردہ کرایا گیا۔ لیکن تلاشی پر سارا معاملہ جھوٹ ثابت ہوا۔ مراد آباد کا کوتوال اسی اقدام کی بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور سرسید کو پتہ بھی چل گیا کہ فلاں کلرک نے یہ حرکت کی ہے لیکن انھوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کچھ عرصہ بعد وہ کلرک کسی اور وجہ سے نوکری سے علیحدہ ہو گیا۔ انہی دنوں سرسید کے ایک انگریز دوست ترقی پر مرکزی حکومت میں جا رہے تھے اور انھیں اپنے دفتر کے لئے ایک لائق فائق انگریزی داں کی ضرورت تھی۔ سرسید کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے اسی ہندو کلرک کو گھر بلوایا اور انگریز دوست سے کہہ سن کر اسے دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھوا دیا۔ یہی ہندو کلرک جب کچھ عرصہ بعد مولانا حالی سے ملا تو اس نے برملا کہا کہ "میں نے سرسید احمد خاں سے برا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا مگر انھوں نے مجھے دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھوا کر بھیج دیا۔ فی الحقیقت سرسید ایسے انسان ہیں کہ جس کے سر پر ان کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے اس کی نجات ہو جائے۔"

قلندرانہ موت

پچھلے دنوں مولوی محمد مقتدا خاں شیروانی نے ہفت روزہ "علی گڈھ" میں سرسید کے سانحہ ارتحال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وفات کے بعد جب ان کا صندوقچہ کھولا گیا تو اس میں صرف پانچ روپے تھے۔ اس پر تو ب

محسن الملک نے روپیہ دیا اور کفن خریدا گیا۔ یہ تھی اس پیکرِ ایثار اور ملت کے سچے غمگسار کی قلندرانہ موت!

صدق جدید کے مدیر مولانا دریابادی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اور اس طرح خاتمہ ہوا اس کا جس کو اسی کے ہم قوم "ابلیس لعین" بلکہ بدتر از ابلیس قرار دے چکے تھے۔

یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے ہمارے اُس امام انقلاب کے اوصاف و کمالات کی۔ یہی وہ جگمگاتی ہوئی خوبیاں ہیں جن کے قالب میں اس زعیم قوم کی سیرت ڈھل کر منظرِ عام پر آئی۔ اور اسی بلند و بالا شخصیت کے یہ زندگی بخش پہلو ہیں جو ایک مردہ قوم کی رگوں میں عروقِ زندگی دوڑانے کے قابل ہو گئے۔ زوال اور شکست کی ماتم سرا میں ہم زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہے تھے اور ہماری موت کا حادثہ عظیم بپا ہونے میں چند لمحوں کی دیر تھی۔ حسرت دیاس کی اس اندوہناک فضا میں پوری قوم کی موت کو زندگی میں بدل دینا تاریخ کا بہت بڑا معجزہ تھا۔ اور یہ معجزہ کسی ایسی ہی شخصیت کی مسیحا نفسی سے تکمیل پا سکتا تھا جو عوام میں رہتے ہوئے بھی انسانی سیرت کے اس ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہو جس کی مثال اس کے ہم عصر زعماء میں مفقود ہو۔ سرسید کے یہی اوصاف و کمالات ان کی مسیحا نفسی کی ضمانت ہیں اور اس حقیقت کے شاہد عادل کہ مردہ قوموں کو زندگی کی سرشاریوں سے اور سنگلاخوں سے بہرہ ور کرنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے اور اس کے لئے کس قدر عظیم و جلیل کیریکٹر کی ضرورت ہے۔ ایک زعیم قوم کی عظمت کا حقیقی معیار یہی ہے کہ وہ اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہوتے ہوئے ماحول کو کس قسم کے انقلاب سے آشنا کر گیا۔ اور سرسید کی زندگی تابناکی ہے کہ جس ماحول میں انھوں نے آغازِ سفر کیا وہاں زندگی آخری سانس لے رہی تھی اور جب وہ اپنی حیاتِ طبعی کا سفر ختم کر رہے تھے تو اس وقت فضاؤں میں چاروں طرف نشاۃ ثانیہ کی اذانیں گونج رہی تھیں۔

ہاں سرسید، تم پر ملت کا سلام ہو۔ تم ہماری صبح بہار کے طائر پیش رس بن کر نمودار ہوئے تھے۔ تم اس نشاۃ ثانیہ کے لئے اذانِ سحر تھے۔ ہماری تاریخ حیات کے نقیب اولین تھے۔ تم نے زہریلے تیروں اور نشتروں کا جواب ہمیشہ محبت بھری اور دلآویز مسکراہٹوں سے دیا اور ڈوبتی ہوئی نبضوں میں ہماری مسیحائی کی۔

اقبال نے تمہارے لئے ہی کہا تھا

نگاہ بلند، سخن دلنواز، روح پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ہماری آزادی اور استقلال کے یہ ہنگامے تمہاری ہی شب بیداریوں، سکوں سوزیوں اور اشک باریوں کے امین ہیں۔ جب تک یہ ملت آزاد اور زندہ ہے تمہارا نام اور کام زندہ رہیں گے۔

راہِ حریت میں تھی تیری صدا بانگِ درا
زندہ باد! اے قوم و ملت کے حقیقی رہنما

عصرِ حاضر کی بے مثال تصنیف

"انسان نے کیا سوچا؟"

از پرویز

پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین!

"فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اندازِ تحریر ایسا سلجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔"

(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور)

مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرینِ عالم کے خیالات کو ترتیب دے کر ایک واضح تصویر پیش کی ہے... یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے اور فاضل مصنف کے تبحرِ علمی کا ثبوت۔

(ہفت روزہ 'قندیل' لاہور)

ٹائپ کی حسین طباعت ـــ سفید کاغذ ـــ جلد مضبوط ـــ گرد پوش سے مزین

قیمت ـــــ بارہ ۱۲ روپے

شائع کردہ:۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ کالونی ـــ لاہور

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔بی شاہ عالم مارکیٹ ـــ لاہور

اسلام اور تعلیم

محترم چوہدری افتخار احمد صاحب کی تقریر جو انھوں نے طلوع اسلام کنونشن کے اجلاس مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۰ء کو فرمائی۔

یہ ایک مسلمہ ہے کہ قوموں کی فنا و بقا کا فیصلہ میدانِ جنگ میں نہیں درس گاہوں میں ہوتا ہے جو اقوام اپنے نظام کے استحکام کے لئے آئندہ نسلوں کو ساتھ ساتھ تیار کرتی رہتی ہیں۔ اُن میں استمرار اور پائندگی ہوتی ہے۔ لیکن جو اس حقیقت سے غفلت برتتی ہیں وہ کچھ عرصہ کی عیش و نشاط کے بعد نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ خواہ ان کا نظام کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔

قرآنی تصورِ زندگی اور اسلامی طرزِ حکومت کا بھی یہی حال ہوا۔ وہ نظام جس کی مثال زیرِ فلک اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اسی ضرورت سے بے توجہی کے سبب چند دن بعد دنیا سے اس طرح ناپید ہو گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ تھا۔ آج دنیا میں (نام نہاد) مسلمان آبادی کا اس قدر رقبہ جو نظر آتا ہے۔ اس کے زوروعروج کا ایک ادنیٰ سا مظہر ہے۔ یہ دین برحق چند دنوں کے بعد آگے کیوں نہ چل سکا، محترم پرویز صاحب نے ان احوال پر نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ مستقل اقدار جو انسانیت کو اس کے مقصود و منتہیٰ تک پہنچانے کا واحد ذریعہ تھیں۔ نبی اکرم صلعم کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرہ سے تھوڑے سے عرصہ میں ناپید ہو گئیں۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ جملہ خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں رسول خدا نے رسالت کے فرائض کو انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات میں مکمل طور پر ادا فرمایا۔ ان میں آپ کی معلمانہ صفات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے دل و دماغ میں قرآنی تعلیمات کو اس طرح جاگزیں کر دیا تھا کہ ان کی زندگی سراپا قرآن نظر آتی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ سے پوری پوری تعلیم و تربیت کا موقعہ تمام اصحاب کو نہیں ملا۔ ان میں سے اکثر کی یہ حالت تھی کہ وہ چند روز آپ کی صحبت میں رہتے۔ تعلیم و تدریس حاصل کرتے۔ قرآن کے مطمعِ نظر کو سمجھتے اور پھر واپس چلے جاتے۔

آپؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلۂ تعلیم و تربیت زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ جن اذہان کو آپؐ نے قرآن کی بصیرت افروز

تعلیم سے معیارِ زمانہ کی نسبت بہت بلند کر دیا تھا، وہ لہٰذا ان ہنگامی معاملات میں مصروف ہو گئے۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ اس فریضۂ تعلیم و تدریس کے لیے سعی و کوشش فرماتے رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھتے چلے گئے۔

بعض اوقات ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ نے سلسلۂ فتوحات کی بجائے سلسلۂ تعلیم و تدریس شروع کر دیا ہوتا تو وہ اس سے کہیں مؤثر رہتا۔ یہ خیال درست ہو سکتا ہے لیکن سلسلۂ فتوحات ہوسِ ملک گیری کی خاطر نہیں بلکہ تقاضائے زمانہ سے مجبور ہو کر شروع کیا گیا تھا۔ وہ عرب قوم جس کی کل کائنات چھوٹے چھوٹے خانہ بدوش قبائل تھی جب مجتمع ہوئی تو عجمی دنیا ایک خطرہ محسوس کرنے لگی۔ ان کی ابتدائی فتوحات نے انھیں اور بھی چوکنا کر دیا۔ اب وہ اس کوشش میں تھے کہ قبل اس کے کہ مسلمان عجمی دنیا کی طرف بڑھیں انھیں عرب ہی میں ختم کر دیا جائے۔ نبی اکرم صلعم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ایک قیصر نے عرب پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اور آپؐ نے اس کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر بھی روانہ کرنا تھا جو بعد میں ابوبکر صدیقؓ نے بھیجا۔ چنانچہ مسلمانوں کیلئے اس بڑھتے ہوئے خطرہ سے اطمینان حاصل کر لینا بہت ضروری تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ تھی جس کا ذکر محترم پرویز صاحب کر چکے ہیں کہ عجمی عوام مسلمانوں میں دینِ اسلام کے نظام سے بہت متاثر تھے اور وہ محسوس کرتے تھے کہ انسانیت کی عزت و تکریم دینِ برحق کی تابعداری ہی سے ہے معاشرہ میں بلندیوں اور پستیوں کے تفاوتِ عظیم نے ان کی زندگیوں کو جہنم بنا رکھا تھا۔ چنانچہ یہی وہ اثر تھا جس نے عراق، شام ایران روم اور دیگر مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو فوری طور پر اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی ورنہ فتح و شکست سے کبھی کوئی اپنے مسلکِ زندگی سے یوں نہیں ہٹ جاتا۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ان علاقوں میں فوری طور پر قرآنی اور مستقل اقدار کی تعلیم و تدریس کی درسگاہیں کھل جاتیں لیکن تقاضائے زمانہ نے ایسا کرنے کا موقع نہ دیا۔

ان علاقوں میں مسلمانوں نے انتظامیہ کا جو عملہ مقرر کیا۔ ان میں بھی اکثر ایسے تھے جنھوں نے صحابہ کرامؓ کی طرح قرآنی فکر و نظر کی پوری تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی رفتہ رفتہ قیصر و کسریٰ کی طرح شاہانہ طرزِ حکومت کی طرف مائل ہو گئے اس رجحان نے قرآن کی سادہ اور انسانیت پرور تعلیم کی بجائے ان میں حکومت و قوت کی خاطر (POWER POLITECS) کی ترغیب دی۔ اس طرح وہ لوگ جو تمام نوعِ انسانی کو ایک بنانے کے لئے گھروں سے نکلے تھے خود مختلف تصورات اور گروہوں میں بٹ گئے۔ گو عرصہ تک عربوں نے ہی اس وسیع سلطنت پر حکومت کی لیکن ان کا اقتدار صرف شاہانہ اقتدار تھا۔ اس میں خلافت علیٰ منہاج نبوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ خاص خاص صحابہ کرامؓ جو اس نہج زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے اور خلفاء کے غاصبانہ افعال پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے رفتہ رفتہ دنیا سے چلے گئے۔ اور چند ہی سالوں میں اس کثیر مسلمان قوم کا ذہن قرآنی تصورِ زندگی سے اس قدر نا آشنا ہو گیا کہ جیسے کبھی قرآن سے انھیں واسطہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ سنہ ۶۵ھ میں معاویہ ثانی نے تختِ خلافت سے اس بنا پر دستبرداری کی کہ اس کے خیال میں خلافت پر اس کے خاندان کا غاصبانہ قبضہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کو یہ حق دیا کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ لیکن مسلمان ذہن اپنی بے بصری کے باعث بے بس و لاچار نظر آتا ہے اگر

ان میں قرآنی تعلیم کا شعور ہوتا تو وہ اس عظیم موقع کو دوبارہ ہاتھ آنے پر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اور ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرتے جو خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کرنے کی اہلیت رکھتا۔ اور اگر انھیں ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا تو معاویہ ثانی جیسے مخلص شخص ہی کو خلیفہ رہنے پر مجبور کرتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ دست بردار ہوتا ہے تو مروان جیسا شخص تخت خلافت پر متمکن ہو جاتا ہے۔

پھر اس کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمر فاروقؓ کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا زمانہ بہت مختصر رہا۔ یہ واقعات قرآنی تعلیم کے تصور سے کس قدر برعکس ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ جاتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو دوسرا عمر ہی نہیں ملتا۔ پھر اپنی طویل تاریخ کا سرسری جائزہ لیں۔ ملوکیت و امریت نے وہ انسانیت کش مظالم ڈھائے جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ملوکیت کی عشرت سامانیاں اور وحشت ناکیاں، پیشوائیت کی روباہ بازیاں اور سحر کاریاں، بادشاہوں کے خدا بننے کے ولولے اور نئے نئے دین جاری کرنے کے حوصلے! یہ سب کیا ہے؟ ــــ قرآن اور مستقل اقدار سے بے گانگی کی دلیل۔

اس کے برعکس ہمیں ان اقوام کی تاریخ کچھ اور بتاتی ہے جنھوں نے اپنی بنیاد درسگاہوں پر رکھی تھی۔ انگلستان میں الیور کرام ویل کے بیٹے رچرڈ کرام ویل کو جانشین مقرر کرنے پر وہ ہنگامہ ہوتا ہے کہ رچرڈ کرامویل کو چند دنوں میں لارڈ پروٹیکٹر شپ سے دستبردار ہونے میں خیر نظر آتی ہے۔ اور اس کے بعد آئینی بادشاہت کے ساتھ جمہوری نظام اس طرح قائم ہوتا ہے کہ آج تک چلا آتا ہے۔ انگلستان کو اس واقعہ کے بعد یکے بعد دیگرے جس قدر قابل اور صاحب علم و عمل لیڈر ملے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اس کی وجہ قوم کی ذاتی صلاحیتیں نہیں بلکہ اس کی درسگاہیں تھیں جو ان کے نظام کے لئے بہتر سے بہتر پرزے مہیا کرتی رہیں۔ خود ہمارے ہاں بھی یہی حالت ہے۔ پاکستان کی مشینری کو چلانے والے جتنے بھی اعلیٰ ذہن ملے ہیں وہ یا تو یورپ کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں یا علی گڑھ یونیورسٹی کے۔ ہمارے ملک کے موجودہ محترم صدر بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے انقلابات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کے وقوع اور مستقل اثرات کی اصل محرک درسگاہیں ہیں۔ آج یورپ صنعتی اور ذہنی انقلاب کا گہوارہ ہے لیکن یہ انقلابات مرورِ زمانہ کے سبب نہیں کہ ایسا بہرحال ہو کر رہتا تھا بلکہ یہ سب ان درسگاہوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جن علاقوں میں ان کی کمی ہے وہ آج بھی یورپ کی نسبت صدیاں پیچھے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور امریکہ، آسٹریلیا اور افریقہ کے وحشی قبائل تو شاید قبل از مسیح کے زمانہ کی بود و باش پر ہی قائم ہیں۔ بھاپ کی قوت سے ریلوے انجن چلانے والے اسٹیفنسن کی اتفاقیہ ایجاد آج صفحہ ہستی پر نظر نہ آتی۔ اگر اس کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کے لئے درسگاہیں (ریسرچ انسٹیٹیوٹ) قائم نہ کر دی جاتیں۔ آج بھی یورپ و امریکہ کی شہرہ آفاق درسگاہوں کو تالے لگا دیں اور پھر دیکھ لیں کہ آئندہ بیس سال میں تہذیب و تمدن کا یہ مرکز کیا سے کیا بن جاتا ہے۔

مسلمان ذہن کی یہ کجی ہے کہ اس نے خالی تبلیغ سے تعلیم کے نتائج لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انسانی تاریخ اس

برگواہ ہے کہ غالی تبلیغ نے وہ نتائج کبھی پیدا نہیں کئے جو تعلیم سے ہوتے ہیں۔ محض وعظ و نصیحت انسانی ذہن پر مستقل اثرات ثبت کرنے سے ہمیشہ عاری رہی ہے۔ اس سے وقتی طور پر جذبات برانگیختہ تو ضرور ہو جاتے ہیں لیکن مستقل نقوش مفقود رہتے ہیں۔ تاریخ ان تجربات کے مصر نتائج پر نوحہ خواں ہے کہ انقلابیوں نے اپنے انقلاب انگیز لٹریچر اور بصیرت افروز تقاریر سے وقتی طور پر عوام میں ایک ہلچل پیدا کر دی لیکن ان کی موت کے ساتھ ان کی تحریک پر بھی موت طاری ہو جاتی رہی۔ شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل اور ان کے رفقاء، عبیداللہ سندھی اور جمال الدین افغانی جیسے باہمت لوگوں کی تعلیمات کہاں ہیں؟ لوگ ان کی قبروں پر تو جاتے ہوں گے لیکن جو انقلاب وہ پیدا کرنا چاہتے تھے اس کی روح ان میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

میں آپ کے سامنے اس حقیقت کو دہرانے کی جسارت کرتا ہوں کہ سرخ قوت آج دنیائے امن کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بنی بیٹھی ہے۔ یہ خطرہ اس کے آلات حرب نہیں بلکہ اس کا وہ معاشی نظام ہے، جو اس کی درسگاہوں سے روسی عوام کے اذہان پر ثبت کر دیا گیا ہے۔ اور غیر اشتراکی دنیا کے عوام کو خائف کر رہا ہے۔ اس کی ترویج انسانیت کے لئے سم قاتل ہے کہ اس کی پشت میں آنے کے بعد وہ حیوانیت میں بدل جاتی ہے۔ روٹی کی ضرورت بے شک ناگزیر ہے لیکن اس کی اتنی بڑی قیمت کہ انسان کو شرف انسانیت ہی سے تہی دامن کر دے، ناقابل فہم سودا ہے۔ مستقل اقدار کے احترام کے بغیر ہر قسم کا نظام سراب ہی سراب ہے جو انسانیت کے لئے کسی وقت بھی ایک عذاب عظیم ثابت ہو سکتا ہے۔ روس نوع انسانی اور خصوصاً ایشیا کی موجودہ کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس پر اشتراکی عقیدہ کو مسلط کرنا چاہتا ہے، جس نظام کی بنیاد انتقام پر ہو وہ سراسر جذباتی فعل ہوتا ہے اور مشتعل جذبات صحت و امن کے لئے حد درجہ باعث نقصان ہوتے ہیں۔

دوسری دنیا سے زیادہ یہ خطرہ مسلمان کو ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دینا چاہیئے کہ خدانخواستہ اگر کمیونزم کسی طرح دنیا پر مسلط ہو گیا تو وہ قرآن کو کبھی ابھرنے نہیں دے گا۔ کیونکہ اس کے چیلنج کا جواب سوائے قرآن کی آئیڈیالوجی کے اور کسی کے پاس نہیں۔ اس کا خدا سے انکار در حقیقت مسلمانوں کو چیلنج ہے جس کا جواب صرف اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے کہ ہم قرآنی دستور حیات سے پوری طرح بہرہ مند ہوں اور اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کر رہے ہوں۔

آج دنیا نظاموں کی تقسیم میں بٹی ہوئی ہے۔ قوت کے زور سے اقوام کو دبانے کا دور بیت گیا۔ اب تو صرف وہی نظام زندہ رہ سکے گا جو انسانیت کو مستقل اقدار پر قائم کردہ نظام کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کرے۔ اور اسے غیر فطری تقسیموں سے نجات دلا دے۔

یقین جانیئے اس دور میں جس قدر قرآنی آئیڈیالوجی اور مستقل اقدار کی عملی ترویج کی ضرورت ہے شاید پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی ہو۔

دنیا انسانیت کش آلاتِ حرب سے تنگ آ چکی ہے اور وہ بسرعت اس کی کوشش کر رہی ہے کہ انسانوں کو خوف و ہراس کی اس لعنت سے نجات دلائے۔ اس کی یہ کوششیں بالآخر کامیاب ہوں گی اور وحشت ناک آلاتِ حرب کو غرقِ آب کرنا

پڑے گا۔ سوچیے! اس کے بعد حقیقی فوقیت کیا رہ جائے گا؟ صرف نظامِ زندگی یعنی وہ نظامِ زندگی جو مستقل اقدار کی رُو سے انسانیت کا احترام و تکریم سکھلائے اس کی زندگی کو امن و سکون دے، اس کے جسم کی پرورش کرے اور اس کی ذات کو نشو و نما دے۔ وہی نظام اس کا نصب العین ہو سکتا ہے۔ ایسا نظام قرآن کی مستقل اقدار کی ترویج کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مستقل اقدار کو درسگاہوں کے ذریعے انسان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیوست کر دیا جائے تاکہ جو ان درسگاہوں سے تربیت حاصل کر کے نکلے وہ چلتا پھرتا قرآن نظر آئے۔

[اس کے بعد محترم چوہدری صاحب نے بتایا کہ سائنس کے انکشافات کس طرح انسان کو قرآنی نظام کی طرف لئے جا رہے ہیں لیکن انسان کا اس طرح قرآن کی طرف جانا باعثِ افتخار نہیں بن سکتا۔ باعثِ فخر وہی اقدام ہوتا ہے جسے انسان دل کے ارادے سے اختیار کرے اور یہ تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا]

پیغمبروں کی زندگیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ حق ایک دو کے اشارے سے نہیں پھیل جاتا۔ اس کے لئے سخت سعی و کاوش کرنی پڑتی ہے۔ انسان کی جہالت کچھ اس قدر عمیق ہوتی ہے کہ چند سیدھے سادھے تصورات کو ذہن نشین کرانے میں پیغمبروں اور مصلحین کی عمریں صرف ہو جاتی ہیں اور اس پر بھی وہ انسانی دل و دماغ پر اپنے خیالات کا ایک ہلکا سا عکس چھوڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حق کی کرن ظاہر ہوئی اور باطل کی ظلمت کافور ہو گئی۔ حق کے قیام کے لئے جان و مال کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔

ہمارے سامنے عمل و سعی کا ایک وسیع میدان ہے۔ ہم نے ابھی اس خلا کو بھی عبور کرنا ہے جو ہماری فکر و تدبر سے ہماری زندگیوں کے سبب اقوامِ عالم اور ہمارے درمیان پیدا ہو چکی ہے اور پھر اس خلا ہی کو عبور نہیں کرنا بلکہ ان سے ہر میدان میں آگے نکلنا ہے تاکہ ہم ان کے چیلنج کا برجستہ جواب دے سکیں کہ دیکھو! انسانیت کی عافیت تمہاری فلسفہ آرائیوں میں نہیں بلکہ پیغامِ حق کی تابعداری میں ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جونہی ہم نے اپنی زندگیوں کو قرآن کے مطابق ڈھال لیا، ہم زندگی کے ہر شعبہ میں برق رفتاری سے ترقی کرنے لگیں گے کیونکہ نظامِ قرآنی ارتقاءِ انسانی کی راہ میں حائل ہونے والی تمام مزاحمتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر آگے بڑھنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور انسانوں میں وجہِ امتیاز صرف ان کا کردار مقرر کرتا ہے۔ جب کردار وجہِ امتیاز ہو تو پھر کون ہے جو اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ پھر کون سی رکاوٹ ہو گی جو اس کی راہ میں دیوار بن جائے گی۔ جب یہ صورت پیدا ہو گی تو انسان کی ذات اور اس کے احوال میں بے پناہ انقلاب ہو گا۔ وہ مہینوں اور برسوں کی مسافتیں گھنٹوں اور دنوں میں طے کرنے لگے گا اور ہر جانب سے سلامتی ہی سلامتی کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی لیکن یہ حالت پیدا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم تصورِ قرآنی کے فروغ و تشہیر کے لئے باقاعدہ درسگاہیں قائم کریں۔ قرآن کی تعلیم کے لئے مکمل نصاب تیار کریں اور اسے ابتداء ہی سے درس و تدریس کا محور بنائیں۔

بالغوں کے لئے ایام الصیام نہایت اعلیٰ نعمت ہیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ قرآنی نظریۂ حیات کی تعلیم و تدریس

کے لئے "بیت الصیام" یا بیت التدریس القرآن قائم کئے جائیں جن میں رمضان کی کلاسیں ہوا کریں۔ اور علوم قرآنی کا انسانی علوم سے موازنہ کرکے اسلامی تصور حیات کی افضلیت علی وجہ البصیرت ثابت کی جائے۔ ان کلاسوں میں جو لوگ شامل ہوں وہ ایک ماہ کے روزے رکھیں اور قرآن کو سبق اول سے شروع کرکے بتدریج اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں۔ ان کے متعلق تازہ خیالات کریں۔ روزوں کی مثال (REFRESHER COURSE) کی سی ہے کہ جو لوگ یہ کورس پورا کریں روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر نظام حیات کو پھر سے تازہ کریں۔ تاکہ آئندہ سال اس پر فکر و عمل کے لئے پہلے سے زیادہ مستعد ہوں۔ یہ کام اس قدر اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے کنونشن ایک کمیٹی مقرر کرے۔ جس کے سامنے میں اپنے فکر کے مطابق اس کی تفاصیل پیش کروں۔

اس قسم کے باغوں کی درسگاہیں اب تو اور بھی زیادہ مفید ہونگی۔ ہماری یہ انتہائی خوش بختی ہے کہ ہماری زندگی میں محترم پرویز صاحب کی نئی تالیف "لغات القرآن" کی جلد اول چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ موصوف نے اس پر جس قدر محنت و کاوش کی ہے۔ اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ اس کی افادیت بے پایاں ہوگی۔ یہ عام مسلمانوں کو اس قابل بنائے گی کہ بلا منت غیرے خود قرآن میں غور و فکر کر سکے۔ اس کے مطالب، مفہوم اور مقاصد کو سمجھ سکے اور اس طرح پیشوائیت کی اجارہ داری سے آزاد ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی اشاعت میں ایک عظیم ذہنی انقلاب مضمر ہے۔ محترم پرویز صاحب کی اس تصنیف پر صد تحسین و آفریں ہے۔ انہوں نے ایک عظیم کام کو تن تنہا پایۂ تکمیل تک پہنچایا جو بظاہر ایک فرد کے بس کا کام نہ تھا۔ یہی جوانمردی اور عالی ہمتی کی دلیل ہے اور ساتھ ہی یہ بے مثال کتاب ہم سے بھی پیہم مساعی کی متقاضی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ جن مقاصد کی خاطر انہوں نے شب و روز کی ان تھک کوششوں سے اسے سرانجام دیا ہے ان کو مستعدی سے تکمیل کریں۔ اس بیش بہا تحفہ سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور قرآن حکیم کے سمجھنے سمجھانے میں اس سے پوری پوری مدد لیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم سال بھر لغات القرآن کی مدد سے قرآن کا مطالعہ کرتے رہیں اور پھر سال کے بعد شہر رمضان میں بیت تدریس قرآن میں جمع ہوں اور پرویز صاحب کی نگرانی میں اسے دہرائیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کریں۔ اگر یہ درسگاہ پرویز صاحب کے ہاتھوں جاری ہو جائے تو ہمارے لئے کس قدر مسرت و انبساط کا باعث ہو؟ یہ بات بظاہر مشکل نظر آتی ہے لیکن جونہی ہم نے اس کے لئے مشترکہ مساعی شروع کر دیں تو یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ یاد رکھیے جب تک ہم قرآنی فکر کی ترویج کے لئے درسگاہیں قائم نہیں کرتے۔ ہمارا کام نامکمل رہے گا۔ کیونکہ مستقل نظام ہمیشہ درسگاہوں سے نکل کر رائج ہوتے ہیں۔ خانقاہوں سے نہیں۔ والسلام

[اس تقریر کے بعد کنونشن نے ایک قرارداد کی رُو سے تعلیمی کمیٹی کے تقرر کا فیصلہ کیا جس کے صدر محترم چوہدری افتخار احمد صاحب منتخب کئے گئے]

نقد و نظر

۱۔ قادیانیت — مطالعہ و جائزہ

اس کتاب کے مصنف سید ابو الحسن ندوی صاحب (معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۵۷-۵۸ء میں شام، مصر و عراق کے جو علماء و اساتذہ اسلامک کالوکیم میں شرکت کے لئے آئے تھے انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی مشہور مذہبی تحریک قادیانیت اور اس کے اساسی عقائد و خیالات کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔۔۔۔ اس موقع پر ان کے ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں کو اس خلاء کا شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ ان کو پیش کرنے کے لئے عربی میں جدید طرز کی کوئی کتاب موجود نہیں۔" یہ کتاب اسی خلاء کو پُر کرنے کے لئے (عربی زبان میں لکھی گئی تھی) ازاں بعد اس کا اردو ترجمہ (خود مصنف نے) کیا اور یہ ترجمہ اس وقت زیرِ تبصرہ ہے۔

یہ خلاء واقعی پُر کئے جانے کے قابل تھا اور محترم ابو الحسن صاحب نے بہت اچھا کیا جو اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ تحریکِ قادیانیت اپنے آپ کو خود ہندوستان اور پاکستان میں (جہاں اکثر لوگ ان کی حقیقت سے واقف ہیں) جس انداز میں پیش کرتی رہتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک عربی ممالک میں (جہاں کے بسنے والے اکثر و بیشتر ان کی حقیقت سے باخبر نہیں) اپنے آپ کو کس رنگ میں پیش کرتی ہو گی! اس اعتبار سے ان لوگوں کے سامنے اس تحریک کو اس کے اصلی لباس میں پیش کرنا نہایت ضروری تھا۔ کتاب کا انداز متین اور سنجیدہ ہے۔ اسلوبِ بیان صاف اور شگفتہ۔ اور معلومات اصلی ماٰخذ پر مبنی۔ طباعت، کتابت، کاغذ خوشگوار ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ دینیات۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔

تحریکِ قادیانیت کے ضمن میں ہم چند ایک معروضات محترم مصنف کی خدمات میں بالخصوص اور دیگر علمی حضرات کی خدمت میں بالعموم پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ یہ تحریک قریب ساٹھ ستر برس سے جاری ہے۔ ان کے خلاف بے شمار (تحریری اور تقریری) مباحثے اور مناظرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے رد میں بہت سا لٹریچر شائع ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ پر بجا اور درست ہے۔ اس لئے کہ جو تحریک ختمِ نبوت کے بنیادی مسئلہ کو توڑتی ہے اس سے زیادہ خطرناک تحریک اسلام کے لئے کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی ہم نے اس امر پر بھی غور کیا کہ وہ بنیاد کونسی ہے جس پر اس تحریک کی عمارت استوار ہے؟ یاد رہے کہ اس کا تعلق یہ

حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس کی بنیاد ہیں ہمارے ہاں کے یہ مروجہ عقائد کہ

(۱) ختم نبوت کے بعد الہام وکشف ومخاطبات ومکالمات کا سلسلہ جاری ہے۔ یعنی اب بھی خدا سے براہِ راست علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۲) حضرت مسیح دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔

(۳) آخری زمانے میں امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اور

(۴) ہر صدی کے سر پر مجدد آئیں گے۔

جہاں تک ۱ کا تعلق ہے، محترم مصنف کو بھی اس کا احساس ہے کہ اس سے ختم نبوت کے بعد عملاً باب نبوت کھل جاتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی کتاب میں شرح وبسط سے لکھا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ان کا طویل اقتباس (بعض مقامات کو حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

ایک غلط اور خطرناک مفروضہ

مرزا غلام احمد صاحب کا ایک مفروضہ جس نے اسلامی ذہن کے لئے بے چینی اور اسلامی معاشرہ کے لئے انتشار کا ایک مستقل دروازہ کھول دیا ہے، یہ ہے کہ وہ "مکالمات ومخاطبات الٰہیہ" کو مذہب کی صداقت کی شرط اور اتباع اور مجاہدات کا قدرتی نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس مذہب میں مکالمات ومخاطبات الٰہیہ کا سلسلہ جاری نہ ہو وہ مذہب مُردہ اور باطل ہے بلکہ شیطانی مذہب ہے اور جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور جس مذہب کے پیرو زہد ومجاہدہ کے باوجود اس دولت سے سرفراز نہ ہوں وہ گمراہ محروم اور نابینا ہیں

مکالمات کو شرط قرار دینے کے نتائج

...... مرزا صاحب نے مکالمات ومخاطبات الٰہیہ کو معرفت ونجات وصداقت وحقانیت کی شرط قرار دے کر اس مذہب کو جس کو اللہ تعالیٰ نے سہل اور ہر شخص کے لئے قابلِ عمل قرار دیا تھا، نہایت مشکل اور نہایت محدود بنا دیا ...... لیکن اگر معرفت ونجات کے لئے مکالمات ومخاطبات الٰہیہ شرط ہیں تو اس دین سے زیادہ دشوار چیز کوئی نہیں۔ اس لئے کہ بکثرت لوگ اس مکالمہ والہام سے فطرۃً مناسبت نہیں رکھتے اور خواہ وہ کیسے ہی مجاہدات کریں۔ مکالمہ والہام کا دروازہ اُن پر نہیں کھلتا بہت سے لوگ اس سے فطری مناسبت رکھتے ہیں مگر ان کو ان مجاہدات کی (جو مکالمات ومخاطبات الٰہیہ کے شرط ہیں) فرصت یا توفیق نہیں۔ وہ عالمگیر مذہب جو ساری انسانیت کی فلاح کے لئے آیا ہے اور سب کو خدا کے دین کی دعوت دیتا ہے معرفت ونجات اور مغفرت ورضا اور وصول الی اللہ کے لئے ایسی کڑی شرط نہیں لگا سکتا جس کو کروڑوں انسانوں میں سے چند پورا کرسکیں۔

پھر قرآن مجید میں مؤمنین اور فلاح یافتہ انسانوں کی صفات ملاحظہ ہوں۔ سورۃ المومنین کا پہلا رکوع پڑھیئے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ الخ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع پڑھیئے وَعِبَادُ

الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا اور خود پہلی سورت کی پہلی آیت پڑھیے۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۚ فِیْهِ ۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ
یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲)

اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو جو کہ یقین کرتے ہیں
بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو۔ اور جو ہم نے روزی دی ہے ان کو اس میں
سے خرچ کرتے ہیں۔

اس میں کہیں بھی مکالمۂ الٰہی کو ہدایت و فلاح کی شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ایمان بالغیب کو ہدایت کی پہلی شرط قرار دیا گیا ہے اور ایمان بالغیب کا مفہوم ہی یہ ہے کہ نبی کے اعتماد پر (جس کو اللہ تعالیٰ اجتبائی طور پر مکالمۂ الٰہی کے لئے انتخاب فرماتا ہے) غیبی حقائق پر جو تنہا عقل اور حواس ظاہری کی مدد سے معلوم نہیں کئے جا سکتے تسلیم کیا جائے۔ اگر مرزا صاحب کا ارشاد تسلیم کر لیا جائے کہ مکالمۂ الٰہی معرفت اور نجات کے لئے شرط ہے تو ایمان بالغیب کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس پر قرآن مجید کا اصرار سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر یہ صحابۂ کرامؓ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کتنے مکالمات و مخاطبات الٰہیہ سے سرفراز تھے؟ اور حدیث و تاریخ سے کتنوں کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کو مکالمہ و مخاطبہ حاصل تھا؟ کوئی شخص جو اس دور کی تاریخ اور اس جماعت کے مزاج و حالات بلکہ انسانی طبائع و نفسیات سے واقف ہے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ایک لاکھ افراد سے متجاوز اس قدسی جماعت کو مکالمۂ و مخاطبۂ خداوندی حاصل تھا اور جب صحابۂ کرامؓ کا یہ حال تھا تو بعد کے لوگوں کا کیا ذکر؟

سلسلۂ نبوت کے انکار کی روح

مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کی یہ اہمیت اور عمومیت درحقیقت نبوت کے خلاف در پردہ بغاوت اور ایک مخفی سازش ہے، مکالمات و مخاطبات کے اس عموم و تسلسل کے بعد عقلاً و عملاً سلسلۂ انبیاء کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید اور تمام آسمانی مذاہب نے انسانوں کی ہدایت اور معرفت الٰہی کے حصول، ذات و صفات اور منشاء خداوندی کی شناخت اور حقائق غیبی کے علم کو سلسلۂ نبوت سے وابستہ اور مربوط کیا ہے۔ ...... مرزا غلام احمد صاحب کے تعلیم تسلسل و بقائے وحی اور مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کے عموم و لزوم پر اگر دقت نظر سے غور کیا جائے اور اس کی علمی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس میں ختم نبوت کے بجائے سلسلۂ نبوت کے انکار کی روح نظر آئے گی اور ہدایت و معرفت الٰہی بھی مسمریزم اور جدید تحریک استحضار ارواح (SPIRITUALISM) وغیرہ کی طرح ایک روحانی تجربہ اور عمل بن کر رہ جاتی

مکالمات کے سرچشمہ کا تعین

پھر ان مکالمات و مخاطبات الٰہی کی تنقید کا کیا معیار ہے اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ انسان جو کچھ سن رہا ہے۔ وہ خود اس کے باطن کی آواز یا اس کے ماحول اور تربیت کی صدائے بازگشت یا اس کی اندرونی

خواہشات اور سوسائٹی کے اثرات کا نتیجہ نہیں ؟ جن لوگوں نے مکاشفات و مکالمات کے قدیم مجموعے دیکھے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان کا کتنا بڑا حصہ ان غلط مفروضات و نظریات کی تصدیق اور تبلیغ کرتا تھا۔ جو قدیم علم الاصنام (MYTHOLOGY) نے پیدا کر دیئے تھے۔ مصر کی فلاطونیت جدیدہ (NEO-PLATONISM) کے روحانی مشاہدات اور ربانی مکالمات ملاحظہ ہوں۔ کیا ان کے مکاشفات اور مکالمات نے اس وقت کے صنمیات اور فلسفیانہ مفروضات کی تصدیق نہیں کی ؟ خود اسلامی دور میں بعض اہلِ مکاشفہ و مکالمہ عقلِ اول سے مصافحہ کرنا اور اس سے ہم کلام ہونا بیان کرتے ہیں جو محض فلسفۂ قدیم بلکہ یونانی علم الاصنام کا ایک ذہنی تخیل تھا۔ خود مرزا صاحب کے مکالمات و مخاطبات میں کتنا بڑا حصہ ان کے زمانہ، ماحول اور تربیت کے تحت الشعوری اثرات کا نتیجہ اور اس انحطاط پذیر اور مائل بہ زوال معاشرے کا علم معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے نشو و نما پایا اور جس میں وہ اپنی دعوت لے کر کھڑے ہوئے بلکہ کتنا بڑا حصہ وہ ہے جس کے متعلق ایک مبصر کو جو کہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ عالمِ غیب کے بجائے ہندوستان کا بیرونی اقتدارِ اعلیٰ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ اب بھی خدا سے براہِ راست علم حاصل کیا جا سکتا ہے، ختمِ نبوت کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اس علم کا نام الہام، کشف، مکالمات، مخاطبات وغیرہ رکھ دینے سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ خدا نے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا وہ آخری مرتبہ نبی اکرمؐ کی وساطت سے کہہ دیا۔ یہ کلامِ خداوندی، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اب خدا سے براہِ راست علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نے جو اقتباس اوپر دیا ہے اس سے مترشح ہوگا کہ زیرِ نظر کتاب کے مصنف بھی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ نبی اکرمؐ کے بعد، خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور کشف و الہام وغیرہ کے عقائد خلافِ اسلام ہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی کشف و الہام کے امکان کو مانتے ہیں (مثلاً) انہوں نے کتاب کے صفحہ ۹ پر مرزا صاحب کا حسبِ ذیل اقتباس دیا ہے۔

> غرض اس حصۂ کثیر وحیِ الٰہی اور امورِ غیبیہ میں اس امت میں سے میں ہی ایک فردِ مخصوص ہوں اور جس قدر مجھ سے پہلے اولیاء اور ابدال اور اقطاب اس امت میں گذر چکے ہیں ان کو یہ حصۂ کثیر اس نعمت کا نہیں دیا گیا۔ پس اسی وجہ سے نبی کا نام پانے کے لئے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹۱)

اس اقتباس پر محترم مصنف نے حسبِ ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

> یہ مرزا صاحب کا محض دعویٰ ہے جو سراسر تاریخی ناواقفیت اور کوتاہ علمی پر مبنی ہے۔ امتِ محمدیہ میں اتنی بڑی تعداد میں جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہیں ایسے اولیائے کبار گذرے ہیں جن پر بارش کی طرح فیوضِ روحانی، الہاماتِ ربانی اور علوم و معارف کا فیضان ہوا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کو وحیِ الٰہی کا نام نہیں دیا، اور نہ کوئی دعوےٰ کیا۔

یعنی محترم مصنف اس کے قائل ہیں کہ ختمِ نبوت کے بعد بزرگوں کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم مل سکتا ہے (اسی کو الہام کہتے ہیں) البتہ انھوں نے اس کا نام "وحی" نہیں رکھا، اور نہ ہی کوئی دعویٰ کیا ہے۔ (جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے) نام کے بدل دینے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ کیا محترم مصنف بتائیں گے کہ حقیقت کے اعتبار سے وحی اور الہام میں فرق کیا ہے؟ یوں بھی بہت سے "بزرگ" ایسے گذرے ہیں جن کے ہاں الہام کے لئے وحی کا لفظ ملتا ہے۔ (مثلاً ابن عربی کا ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے) باقی رہا کسی کا دعوے نہ کرنا" سو ہمارے ان "اولیاء کرام" کے ہاں ایسی ایسی باتیں ملتی ہیں جو مرزا صاحب کے دعاوی سے کچھ کم نہیں۔ (مثلاً) ان "اولیاء کرام" میں شیخ اکبر ابن عربی کا جو مقام سمجھا جاتا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ ان کی کتاب "فصوص الحکم" بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں۔

> اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحب وحی دونوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اگرچہ رسول اللہ کے خلیفہ (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرع رسولؐ پر عمل کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن وحدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں صریح سطر حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں۔ اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن وحدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود امر حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادہ کشف والہام اور مادہ وحی رسول ایک ہے۔۔۔۔ صاحب کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے۔۔۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔۔۔۔ پس عنایں خلیفہ ہیں۔ وہ معارف خاتم النبیین و مادۂ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انھوں نے لئے تھے۔۔۔۔۔ خدا نے تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے[1]

آپ غور کیجئے کہ اس میں کیا کم دعاوی کئے گئے ہیں؟

یاد رکھیئے۔ کشف والہام کا عقیدہ رکھتے ہوئے آپ بابِ وحی کو کبھی بند نہیں کر سکتے۔ اس عقیدہ کی جڑ کو کاٹیے تو وحی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ "اولیاء کرام" کے اسی قسم کے اقوال ہیں جنھیں مرزا صاحب کے دعاوی کی تائید میں پیش

---

[1] ہم نے یہ اقتباس، مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی کے اس ترجمہ فصوص الحکم سے دیا ہے جو [illegible] میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباسات مختلف جگہ سے لئے گئے ہیں۔ بالخصوص حکمت وجودیہ فی کلمۃ داؤدیہ سے۔

کیا جاتا ہے۔

اب شق دوم کی طرف آیئے یعنی نزولِ حضرت عیسیٰؑ کا عقیدہ۔ اس باب میں قادیانی حضرات جو انداز اختیار کرتے ہیں لکھا پڑھا طبقہ بہت جلد ان کی "معقولیت" کا قائل ہو جاتا ہے۔ (مثلاً) یہ بحث کچھ اس انداز کی ہوتی ہے۔

قادیانی :۔ کیا آپ نزولِ حضرت مسیحؑ کے قائل ہیں؟

چونکہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ مروج ہے اور بعض روایات بھی اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں اس لئے مجیب کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس کا قائل ہے۔

اس اقرار کے بعد قادیانی مناظر کی طرف سے کچھ اس انداز کی گفتگو ہوتی ہے۔

> کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ سچ مچ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور وہ بنفسِ نفیس آسمان سے نیچے اتریں گے؟ یہ تو بڑی تعجب انگیز سی بات ہے۔ نزولِ مسیحؑ سے مراد یہ ہے کہ آخری زمانے میں امتِ محمدیہ میں ایک ایسا شخص اٹھے گا جو حضرت مسیحؑ کی صفات کا حامل ہوگا۔ یعنی وہ مثیلِ مسیحؑ ہوگا۔

یہ بات بڑی جچی تلی سی معلوم ہوتی ہے اور سننے والا اس کا قائل ہو جاتا ہے۔

نزولِ مسیحؑ کا عقیدہ قرآن کریم سے تو ثابت نہیں۔ باقی رہیں روایات تو وہ بھی (درایت اور موافقِ قرآن ہونے کا اصول تو ایک طرف) اصولِ روایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ (طلوع اسلام میں ان روایات پر کافی بحث ہو چکی ہے) لہٰذا جب تک یہ غیر قرآنی عقیدہ موجود ہے، آپ قادیانی تحریک کو بمشکل شکست دے سکتے ہیں۔

اس کے بعد "آنے والے" کے عقیدہ کو لیجئے۔ قرآن کریم سے واضح ہے کہ جس "آخر الزمان" آنے والے کو آنحضرتؐ چودہ سو سال ہوئے سرزمینِ حجاز میں آگئے اس کے بعد کوئی اور آنے والا نہیں۔ "آنے والے" کا تصور قوموں کے دور انحطاط کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے بعد دین کا سلسلہ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کے ذریعے قائم رہنا تھا۔ جب تک وہ سلسلہ باقی رہا کوئی کسی آنے والے کا منتظر نہیں تھا۔ جب وہ سلسلہ باقی نہ رہا تو پھر "آنے والے" کا تصور پیدا ہوا۔ اب بھی دین کے قیام کی شکل یہ ہے کہ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کیا جائے۔ جب وہ نظام پھر سے قائم ہو جائے گا تو "آنے والے" کا انتظار ختم ہو جائے گا۔ اس وقت نہ کوئی ایران کے بہاء اللہ یا باب کی ضرورت محسوس کرے گا نہ "قادیانی نبی، مثیلِ مسیح، مہدی اور مجدد" کی۔ خدا کی زندہ کتاب اور اس کو عملاً ضابطۂ حیات بنانے والا نظام جو نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق قائم کیا جائے گا، امت کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھے گا اور یہی دینِ قیم ہے۔

قادیانی تحریک یا اسی قسم کی اور تحریکوں کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ امت سے اس قسم کے غیر قرآنی عقائد کو ختم کیا جائے۔ ان عقائد کو باقی رکھنا (بلکہ مستحکم کئے جانا) اور ان کے نتائج و عواقب پر شور اٹھانا کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔

کیا ہم محترم مصنف اور ان کے دیگر ہم خیال حضرات سے اس کی توقع رکھیں کہ وہ ہماری ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے

غور کریں گے؟ دین کا قیام اور امت کی بقا کا راز ختم نبوت کے اصولی عقیدہ میں مضمر ہے۔ لہٰذا ہر وہ غیر قرآنی تصور یا عقیدہ جس کی زد بالواسطہ یا بلاواسطہ ختم نبوت کے عقیدہ پر پڑتی ہو اس قابل ہے کہ اسے جلد سے جلد امت کے دل و دماغ سے محو کیا جائے۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قادیانی تحریک کو شکست دینے کے لئے اپنے ہاں کے بعض عقائد سے انکار کر دیں۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ یہ تمام عقائد (جن پر اس تحریک کی بنیاد ہے) غیر قرآنی ہیں لیکن چونکہ یہ ہم میں مروج ہیں اسلئے یہ تحریک اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر ہم ان غیر قرآنی عقائد کو اپنے ہاں سے ختم کر دیں تو اس قسم کی تحریکیں جو ان غلط سہاروں سے فائدہ اٹھاتی ہیں، باقی نہیں رہ سکیں گی۔

قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں

انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کا انکشاف اور حل

سلیم کے نام خطوط

(جلد اوّل اور جلد دوم)

(تیسری جلد بھی عنقریب شائع ہو رہی ہے)

یہ حقیقت کشا خطوط قلب سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں اور نوجوانان ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جاں نواز تحریک ہیں۔ مفسر قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص، دلکش، شگفتہ اور آسان فہم انداز نگارش۔ تینوں جلدیں خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہیں۔ عمدہ نفیس کاغذ، مضبوط جلد، حسین سہ رنگا گرد پوش۔

قیمت۔ جلد اول آٹھ روپے جلد دوم چھ روپے۔ جلد سوم چھ روپے

مکتبہ طلوع اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

بھول بھلیاں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے عطا کیا۔ اس کی تعلیم نہایت واضح، صاف، کھلی کھلی، اُجلی اور نکھری تھی۔ اس قدر صاف اور واضح کہ عربوں جیسی اونٹ چرانے والی قوم نے اسے سمجھا اور اس پر عمل کر کے اس کے نتائج سے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ لیکن بعد میں، جب عجمی سازشوں نے امت کو قرآن سے بیگانہ بنانے کی مہم شروع کی تو قرآنی تعلیم کی جگہ ایسے عقائد و تصورات نے لے لی جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ اس طرح، انہوں نے زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ پر چلنے والے کاروان کو ایسی بھول بھلیوں میں پھنسایا جن سے وہ آج تک نہیں نکل سکا۔ ان بھول بھلیوں کا سرچشمہ یہودی روایات، عیسائی رہبانیت، افلاطونی فلسفہ اور مجوسی عقائد تھے۔ انہی کے مجموعہ کا نام "اسلام" قرار پا گیا۔ اگرچہ ان بھول بھلیوں کی ہر گردش اپنی جگہ دشمنِ دین و دانش اور رہزنِ علم و آگہی ہے لیکن ان میں تصوف کی خلام گردش کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تصوف میں کس قسم کے طلسمِ ہوشربا کو "معرفت" سمجھا جاتا ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان وادیوں سے خود گذرے ہیں۔ لیکن ہم قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے اس کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے وہ کسی حد تک دیکھ سکیں گے کہ ان میں کن باتوں کو "معرفت" قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایک مقالہ ہے جسے جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد۔ دکن) کے فلسفہ کے استاد ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے لکھا ہے (آپ فلسفۂ تصوف پر اکثر لکھتے رہتے ہیں) اور دہلی کے ماہنامہ "برہان" کی نومبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہمیں اس کا افسوس تو ضرور ہے کہ اس سے طلوعِ اسلام کے کتنے صفحات ضائع ہو جائیں گے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ قارئینِ طلوعِ اسلام کو اندازہ ہو جائے گا کہ اُمت کو قرآن جیسے صاف اور شفاف چشمۂ علم و بصیرت کو چھوڑ کر ہزار برس سے کس دلدل میں پھنسی چلی آ رہی ہے۔ اس مقالہ میں آپ کو قرآن کی آیات بھی ملیں گی اور بعض "روایات" بھی جنہیں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کے متعلق تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ ان کے مفہوم کو کس بُری طرح مسخ کیا گیا ہے۔ باقی

رہیں "روایات" سو ان کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب روزِ محشر نبی اکرمؐ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ تم نے اس قسم کی خلافِ قرآن باتوں کو میری طرف منسوب کرنے کی جرأت کس طرح کر لی' تو نہ معلوم یہ حضرات اس کا کیا جواب دیں گے؟

بہرحال اب آپ ان بھول بھلیوں کی سیر کیجئے۔ (طلوعِ اسلام)

حقیقتِ نفس

با من بودی منت نمی دانستم — یا من بودی منت نمی دانستم
چوں من شدم از میاں ترا دانستم — تا من بودم منت نمی دانستم

(فیض کاشانی)

انا من اھوی ومن اھوی انا — لیس فی المرآۃ شیٔ غیرنا
لا انادیہ ولا اذکرہٗ — ان ذکری وندائی یا انا

(شیخ اوحدالدین کرمانی)

نفس کی حقیقت کو سمجھنا ہو تو خلق کا تعلق حق سے، عبد کا رابطہ رب سے، بندہ کا تعلق خدا سے سمجھنا ضروری ہے اس رابطہ تعلق کی توضیح تفصیل کے ساتھ ہم نے "قرآن اور تصوف" میں کی ہے یہاں حقیقتِ نفس کو واضح کرنے کے لئے اجمالاً اس کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ اساس پیشِ نظر ہے اور مسئلہ کا حل سمجھ میں آجائے

وجودِ حقیقی حق تعالیٰ ہی کا ہے ؏

موجود بحق واحد اوّل باشد

وہ قائم بالذات ہیں اور متصور بالذات' وہ ازل سے علیم بھی ہیں۔ صفتِ علم سے متصف ہیں۔ صفتِ علم ذاتِ حق ہیں ؏

جاوداں ہست و بود و خواہد بود

اب ظاہر ہے کہ علم بغیر معلومات کے ممکن نہیں۔ کیونکہ عالم کو کسی "معلوم" ہی کا علم ہوسکتا ہے اور معلوم ہی کو جاننے کی وجہ سے وہ عالم کہلاتا ہے لہٰذا حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات عالم۔ علم۔ معلوم میں ابتداہی سے تمیز قائم کی جاسکتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معلوماتِ الٰہیہ کیا ہیں؟ حق تعالیٰ ازل سے عالم ہیں تو کس چیز کے عالم ہیں؟

معلوماتِ الٰہیہ ذواتِ اشیا یا حقائقِ ممکنات کے سوا اور کیا ہوسکتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا جتنی چیزیں ہیں سب ان کی مخلوق ہیں "اللہ خالق کل شیئٍ" سے قرآن اس طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مخلوقات کو وہ جان کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ پیدا کرکے

جانتے ہیں ورنہ تخلیق کے قبل جہل لازم آئے گا جو ان کی شان کے منافی ہے "الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر" (پ ۲۹- ع ۱) سے قرآن اس جہل کی تردید کر رہا ہے۔ اور خالق کو علیم یہ کہہ کر ثابت کر رہا ہے کہ ھو الخلاق العلیم (پ ۲۳ ع ۴) مخلوقات کو وہ جس طرح جان کر پیدا کرتے ہیں اس طرح تخلیق کے بعد بھی وہ حق تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہیں۔ ان کو معلوم ہوتی ہیں۔ ھو بکل شیئ علیم (پ ۲۷ ع ۲) سے قرآن اس چیز کو واضح کر رہا ہے۔ لہٰذا تمام اشیاء حق تعالیٰ کے "معلومات" ہیں۔ ان کی ماہیت ہی معلوم ہونا ہے۔ یہ ازل سے علم الٰہی میں ثابت اور ان کی ذات پر عارض یا ان کی ذات میں مندرج ہیں۔

مخلوقات کو جو ازل سے حق تعالیٰ کے علم میں ہیں بالفاظ دیگر جو ازل سے معلومات حق ہیں اور اشیاء مخلوقہ کی ذوات یا حقائق ہیں جن کے مطابق اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام نے "اعیان ثابتہ" سے تعبیر کیا ہے یہ "صور علمیہ" بھی کہلاتے ہیں۔ یہ علم الٰہی کے تعینات ہیں ان کو "اعلام" یا "معلومات حق" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ محض علم حق کی صورتیں ہیں۔ خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا۔ خارجی وجود کے لحاظ سے گویا معدوم ہیں۔ ان کو محض وجود علمی یا ثبوت ثبوتی حاصل ہے۔ ان کے مطابق خارج میں تخلیق ہوتی ہے خود یہ حق تعالیٰ کے علم میں ثابت ہیں ان کو کبھی وجود خارجی نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لئے شیخ اکبرؒ نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ "الاعیان الثابتہ ما شمت رائحتہ الوجود اصلا" انھوں نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی۔ انھیں فنا نہیں۔ کیونکہ ان کا فنا ہونا علم حق کا فنا ہونا ہے۔ یہ ازلی ہیں اور ابدی۔ حکماء و فلاسفہ کی اصطلاح میں ان کو "ماہیات اشیاء" کہا جاتا ہے۔ معتزلہ کے ہاں ان کے لئے "شئ ثابت" اصطلاح ہے اور متکلمین نے انھیں "معدوم معلوم" سے یاد کیا ہے۔

اعیان ثابتہ میں سے ہر عین کا ایک اقتضائے ذاتی ہوتا ہے جس کو استعداد یا قابلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ عین کی گویا ماہیت یا فطرت یا خصوصیت خاصہ یا لازمہ ذاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دوسرے اعیان سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔

ہر عین اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے ایک متعین صورت ہے۔ اس تعین و تمیز کی وجہ سے اس کے خاص اقتضاآت و قابلیات ہیں جو بعینہٖ کسی دوسرے عین کے نہیں ہو سکتے۔ ہر عین اس معنی میں ایک تقید ذاتی رکھتا ہے۔ یہیں سے ایک باریک نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ علم الٰہی میں شروع سے ایک طرح کی تقیدی پائی جاتی ہے۔ فافہم وتدبر۔ اس تقید کو ابتدا میں نہ مانیں تو خارجی کائنات میں اشیاء کی تقید کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

عین کی اس قابلیت و اقتضاء کو قرآن کی زبان میں "شاکلہ" کہا گیا ہے قل کل یعمل علی شاکلتہ" (پ ۱۵ ع ۹) یعنی ہر شے اپنی ذاتی قابلیت یا اقتضاء کے مطابق عمل کرتی ہے۔ اور اس کی اس قابلیت و وسعت سے زیادہ اس پر بار بھی نہیں ڈالا جا سکتا۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ (پ ۳- ع ۴۰)

اعیان ثابتہ یا ذوات خلق غیر مخلوق یا غیر مجعول ہیں، اور ان کے اقتضآت و شاکلات بھی، جو ان کے لوازم ذاتیہ ہیں غیر مخلوق و غیر مجعول ہیں۔ اعیان کے غیر مجعول ہونے کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی علم کی صورتیں ہیں اور حق تعالیٰ کا علم ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ اس لئے اعیان بھی لازماً غیر مخلوق اور ازلی ہوں گے۔ اور یہ بھی بتلایا جا چکا ہے کہ اعیان کا وجود خارجی نہیں۔ وہ

محض ثبوت علمی رکھتے ہیں۔ یعنی علم حق جس کو وجود خارجی نہ ہو وہ مجعول یا مخلوق کیسے کہلایا جا سکتا ہے۔ اس دلیل کو مولانا جامیؒ نے اس طرح ادا فرمایا ہے۔

اعیانِ بحضیضِ عین ناکردہ نزول　　حاشا کہ بود بجعلِ جاعل مجعول

چوں جعل بود افاضۂ نورِ وجود　　توصیف عدم بآں نباشد معقول

اعیانِ ثابتہ یا صورِ علمیہ یا ذواتِ خلق ذاتِ حق (یا علمِ حق) میں مندرج ہیں۔ لہٰذا ان میں من حیث الاندراج عینیت پائی جاتی ہے من الازل الی الابد لیکن یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ ذواتِ خلق اور ذاتِ خلق میں من حیث الذات غیریت ہے۔ من الازل الی الابد اس لئے کہ ذاتِ خلق میں صورت ہے، یہ تعین و تمیز، حدود و مقدار رکھتی ہے اور ذاتِ حق بے صورت ہے۔ غیر مقید ہے مطلق ہے۔ صورت کے تمام لوازم سے منزّہ ہے۔ ذاتِ خلق وجودِ ذاتی نہیں رکھتی۔ علمِ حق میں ثابت ہے۔ معدوم اضافی ہے۔ ذاتِ حق وجود ذاتی رکھتی ہے۔ عدمیت سے منزّہ ہے۔ ذاتِ خلق صفاتِ عدمیہ سے موصوف ہے: موت، جہل، اضطرار، عجز، صمم، بکم، عمی سے متصف ہے اور ذاتِ حق صفاتِ وجودیہ سے موصوف ہے یعنی حیات۔ علم۔ قدرت۔ ارادہ۔ سماعت۔ بصارت۔ کلام سے متصف ہے۔ ذاتِ خلق قابلیاتِ امکانیہ و نفعلیہ رکھتی ہے فعل نہیں۔ ذاتِ حق۔ ذاتِ خلق کے قابلیاتِ امکانیہ سے منزّہ ہے کیونکہ اس میں فعل ذاتی ہے۔ وہ افعال حقیقی ہے۔[1]

مختصر یہ کہ ذاتِ حق موجود اور ذاتِ خلق معدوم (بہ عدمِ اضافی) لہٰذا ان دونوں میں من حیث الذات غیریت پائی جاتی ہے اور من حیث الوجود عینیت حقیقی (کیونکہ وجودِ حق عین وجودِ خلق ہے یعنی وجود واحد بصورِ اعیانِ خلق موجود و ظاہر ہے) اس کی تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

اعیانِ ثابتہ یا صورِ علمیہ حق یا ذواتِ خلق کی حقیقت کو اس طرح واضح طور پر سمجھ لینے کے بعد اب تخلیق کا راز سانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔

ہش دار کہ راہ خود بخود گم نکنی!

سوال یہ ہے کہ ذواتِ اشیاء جو معلوماتِ حق ہیں، صورِ علمیہ حق ہیں، جو از قبیلِ اعراض ہیں، با تعبیر علماء ثابت ہیں۔ ان کا نمودِ وجودِ خارجی میں کس طرح ہوا؟ "کن فیکون" کا راز کیا ہے؟

ذواتِ اشیاء یا صورِ علمیہ کے نمودِ خارجی کے متعلق تین احتمالات ہو سکتے ہیں۔

(۱) صورِ علمیہ کا نمودِ خارجی بغیر کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے ہو گیا۔ یہ احتمال عقلاً محال ہے۔ کیونکہ صورِ علمیہ اعراض ہیں اور بغیر وجود (معروض) کے، اعراض کا ظاہر ہونا ناقابلِ تصور ہے۔ قبلِ تخلیق وہ عارض ذاتِ حق تھے۔ بعد از خلق بھی بغیر کسی معروض کے ان کا نمود

---

[1] نصوصِ قرآنی سے اس کی تائید کے لئے دیکھو قرآن اور تصوف "باب قرب و معیت"

نہیں ہو سکتا۔ ہذا ہو الظاہر۔

(۲) صورِ علمیہ کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے اعراض ہیں۔ لیکن یہ معروض (وجود) غیرِ ذاتِ حق ہے۔ یہ احتمال بھی باطل ہے۔ کیونکہ وجود صفت حق تعالیٰ ہی کو ہے۔

۱۶ الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل:

(۳) صورِ علمیہ کسی ذاتِ متقوم یا معروض کے اعراض ہیں اور یہ معروض وجودِ مطلق ہے۔ جو غیر ذاتِ حق نہیں۔ یہی ذات "قیوم" صورِ علمیہ کی معروض ہے جس سے ان کی نمودگی ہو رہی ہے۔ یہی گویا ان کی حقیقت ہیولانی ہے جس پر یہ عارض ہیں۔ یہی مفہوم اس آیت کریمہ سے تعبیر ہو رہا ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۱۴۔ ع ۶) کیونکہ تعالیٰ حق کی صفت واقع ہوئی ہے اور لغتاً واجب الوجود کا نام حق ہے۔ آیت کریمہ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (پ ۱۶۔ ع ۱۰) بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک اور جگہ بطور حصر ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ۔ اسی طرح ایک اور جگہ مومنوں کو خاص طور پر علم عطا کیا جا رہا ہے خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۲۰۔ ع ۱۶) اہل علم سے خطاب فرمایا گیا ہے: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (پ ۱۱۔ ع ۶)

لغتاً و شرعاً وجودِ مطلق کا نام ہی حق ہے۔ حق ہی حقیقتِ ہیولانی کا مادہ ہے۔ باعتبار اشتقاق حق و حقیقت کا مادہ بھی ایک ہے۔ ساری صورِ علمیہ یا ذواتِ اشیاء "بالحق" ظاہر ہیں۔ لہٰذا تخلیق و تکوین عالم میں ذاتِ حق، وجود حق ہی کار فرما ہے۔ یہی سرِ "ہو الظاہر" ہے جس کی تفسیر "ان اللہ ھو الحق المبین" سے ہو رہی ہے یعنی اللہ ہی ظاہر ہیں۔ یا اللہ ہی حق ہیں جو ظاہر ہیں۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض (پ ۱۸۔ ع ۱۱) سے اس بیان کی مزید تائید ہو رہی ہے۔ فافہم و تدبر۔

ذرا کھول کر اس راز کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے حق تعالیٰ بحال و بحد ذاتہٖ جیسے کے ویسے رہ کر بلا تبدیل و تغیر بلا تعدد و بلا تکثر، صفت نور کے ذریعے بصورتِ معلوم خود ظاہر ہو رہے ہیں تو معلوم کے مطابق خلق کا نمود وجود ظاہر میں بطور وجود ظلی ہوا اور اعتبارات الٰہیہ خلق سے وابستہ ہو گئے

وہی وجودِ منزہ کہ بانزاہت خود ہوا ہے جلوہ نما با شباہت ہر شے

ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئ علیم۔

خوب سمجھ لو کہ تخلیق اشیا کا

(۱) عدمِ محض سے پیدا ہونا نہیں ہے کیونکہ عدم سے عدم ہی پیدا ہوتا ہے۔

(۲) نہ ہی عدمِ محض کا اشیاء کی صورت میں نمایاں ہونا ہے کیونکہ عدمِ محض تعریف ہی کی رو سے کوئی شے نہیں کہ ہستی کا مادہ بن سکے یا اس کو کسی ہستی کی صورت میں ڈھالا جا سکے۔ العدم لا یوجد ابدا

(۳) نہ ہی حق تعالیٰ کا خود صورتوں میں تقسیم ہو جانا ہے کیونکہ وہ تبعیض و تجزی سے منزہ ہیں۔ تخلیق حق تعالیٰ کا مع بقاء علی

اہرعلیہ کان بصورِ معلومات صورِ علیہ بمصداق ہو الظاہر تجلی فرماتا ہے۔ یہ تجلی یا تمثل ان صورِ علیہ (ذوات اشیاء، حقائق کیانیہ) کے مطابق ہورہی ہے جو ذاتِ حق میں مخفی اور علمِ حق میں مندرج ہیں۔ اس تجلی و تمثل کا نتیجہ ہے کہ اشیاء کا ظہور باحکام و آثار خود بالتفصیل ان کی قابلیتِ ذاتی کے مطابق خارج میں جو وجود ظاہر ہے ہو رہا ہے۔ صاحبِ گلشن راز نے اپنے الفاظ میں اس راز کو اس طرح ادا کیا ہے:-

عدم آئینہ ہستی است مطلق — کزو پیداست عکس تابشِ حق

(صورِ علیہ[۱])

عدم چوں گشت ہستی را مقابل — درو عکس اندر حال شد حاصل

شد آں وحدت ازیں کثرت پدیدار — یکے را چوں شمردی گشت بسیار

عدم در ذاتِ خود چوں بود صافی — ازو با ظاہر آمد گنج مخفی!

حدیثِ کنتُ کنزاً را فرو خواں — کتا پیدا بہ بینی سرِ پنہاں!

جب تم پر یہ راز آشکارا ہو چکا کہ حق تعالیٰ ہی صفتِ نور سے بصورتِ معلوم خود ظاہر ہو رہے ہیں تو تم کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ ذاتِ مطلق کے مرتبۂ وحدت میں چار اعتبارات ہوتے ہیں۔ وجود، علم، نور، شہود۔ یہ محض صلاحیتِ ذات ہیں، تعددِ وجودی نہیں رکھتے، ملحوظ ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ موجود ہیں (وجود) اپنی ذات و صفات و افعال پر اجمالاً مطلع ہیں (علم) اپنے پر ظاہر و روشن ہیں (نور) اور اپنی ذات کے اس طرح آپ شاہد ہیں۔ (شہود) ان اعتبارات کو ذاتی اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کو صفات نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان چاروں اعتبارات میں تمام صفات، اسماء الٰہی، اسمائے کیانی مندرج ہیں، لاندراج الکل فی بطون الذات کالمفصل فی المجمل و کالشجر فی النواۃ۔ غنائے مطلق اس مرتبہ کے لئے لازمی ہے کیونکہ ذاتِ مطلق اس اجمالی مشاہدہ کی وجہ سے تمام تفصیلات سے مستغنی ہے "ان اللہ لغنی عن العالمین" اس جانب اشارہ ہے۔

دامانِ غنائے مطلق پاک آمد پاک — ز آلودگی نیاز ما مشتے خاک

چوں جلوہ گر و نظارگی خود او ست — گر ما و تو درمیان نباشیم چہ باک

(جامیؒ)

جب حق تعالیٰ صفتِ نور کے ذریعہ بحالہٖ بحدِ ذاتہٖ جیسے کہ ویسے رہ کر بلا تغیر و تبدل و حلول و اتحاد صورتِ معلوم سے ظاہر ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ کا نور معلوم سے متعلق ہو کر روح، ان کا علم معلوم سے متعلق ہو کر قلب، ان کا وجود معلوم سے متعلق ہو کر جسم، اور ان کا انا معلوم سے متعلق ہو تو نفس کہلاتا ہے۔ ان سب کا مرکز ہویتِ مطلقہ ہے۔ فافہم و تدبر۔ اس کی وضاحت اس نقشہ سے ہو سکتی ہے۔

---

[۱] اس کی دلیل "قرآن و تصوف" ص۱۰۰ تا ۱۰۱ پر دیکھو۔

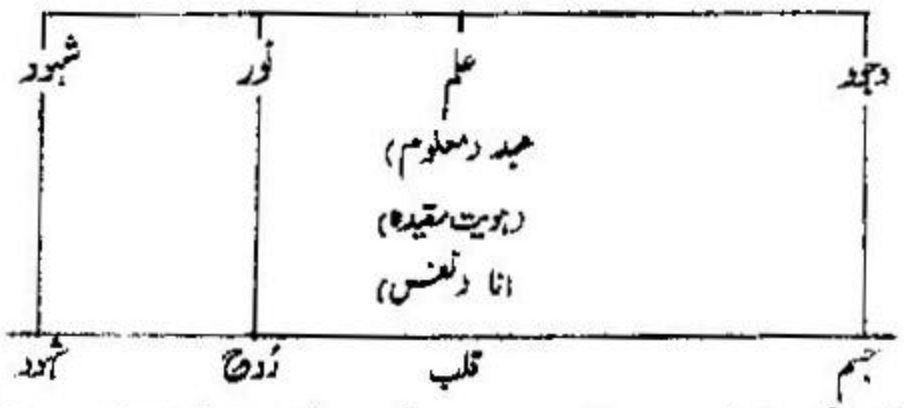

خوب سمجھ لو کہ ہمارا نفس یعنی ہماری ذات درحقیقت وہی صورتِ علمیہ (عین ثابتہ) ہے جو علمِ حق میں ثابت ہے جس کو فی نفسہٖ وجود نہیں۔ معدوم فی الخارج ہے "ما شممت رائحۃ الوجود اصلا" اور چونکہ قلبِ حقائق محال ہے۔ معدوم کبھی موجود نہیں ہو سکتا پس جو موجود ہے فی الحقیقت وہی واجب الوجود ہے "لا موجود الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" حق تعالیٰ ہی کا انا صورتِ معلوم میں نفسِ انسانی کہلاتا ہے اور زبانِ قوم میں "ہویت مقیدہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو کسی عارف نے سوالیہ طرز میں کیا خوب پیش کیا ہے

از حق بجز حق دگر چہ روید بابا؟ — از حق بجز حق دگر چہ گوید بابا؟

در شدت این ظہور بہر صفت — حق را جز حق دگر کہ جوید بابا؟

شیخ اوحدالدین کرمانیؒ جو شیخ اکبرؒ کے معاصر تھے صاف صاف کہہ گئے ہیں۔

ذاتم ز ورائے حرف بیرون ز حد است — در چشمۂ لطفِ آبِ حیاتم مدد است

(حقیقت)

علت ز احد بہ اوحد آمد حرفے — علت بگذار کہ یک! وحد احد است

ابو حاتم عطار نے ابو سعید خزاز سے اس یافت کے بعد فرمایا تھا "کسے ماندہ کہ می گوید اللہ"۔ حضرت شبلیؒ اہل بغداد سے فرمایا کرتے تھے "شما می گوئید اللہ تعالیٰ بنفسِ خود من می گویم حقا بحق" "قل اللہ ثم ذرھم"! شیخ الاسلام عبداللہ انصاریؒ کا ارشاد ہے۔

او جوئندہ خود ہمراہ است — دست جوئندہ خود گرفتہ در طلب

خود می تازاند ہو الکل بالکل" کسی صوفی کا مشہور قول ہے "ہمہ خلق می گویند بیچے دا ز ہزار و می آویزند و ایں قوم می گویند بیچے دا زاں شان خود می گریزند"

الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل — وکل نعیم لا محالۃ زائل

اس حقیقتِ باطنی سے واقف ہونے کے بعد اہل حق پر یہ امر متحقق ہو گیا کہ اپنے نفس کی معرفت عین معرفتِ حق ہے، چونکہ ہر نفس اس حقیقت الحقائق کی صورت ہے، اس کی طرف اشارہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس کی روایت بخاری و مسلم نے کی ہے کہ "خلق آدم علی صورتہ"

اس حدیث کی توضیح سے ہمارے مقالہ کی مزید تائید ہوتی ہے، اس لئے ہم اپنے طریق سے اس کی مختصر وضاحت پیش کرتے ہیں۔

دیکھو "خلق آدم علی صورتہ" میں "صورت" سے مراد صورتِ ظاہری نہیں ہو سکتی۔ جو آنکھ، ناک، رخسار وغیرہ کی خاص ترکیب کا نام ہے، ورنہ اس صورت میں ہمیں ضمیر صورت، آدم ہی کی طرف پھیرنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ صورت جسم و ہیئت کی صورت ہے اور حق تعالیٰ جسموں کے خالق ہیں، مشابہتِ جسمی سے منزہ ہیں۔ صورت سے مراد صورتِ ظاہری لے کر اور صورت کو ضمیر آدم کی طرف پھیر کر خلق آدم علی صورتہ سے لازماً مطلب یہ ہوگا کہ آدم کو آدم ہی کی صورت پر پیدا کیا جو آدم ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور جو تمام مخلوقات سے ممیز ہے۔ اس میں جو تکلف ہے وہ ظاہر ہے۔

صورت سے مراد "صورتِ معنویہ" بھی ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق ترتیب و ترکیبِ معنوی پر ہوتا ہے۔ یہ صورت امور معقولیہ سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "صورتِ واقعہ یہ ہے" یا "صورتِ مسئلہ یوں ہے"۔ یعنی اس کی کیفیت یہ ہے تو صورت سے مراد "کیفیتِ معنوی" ہوئی۔ اس طرح اگر صورت سے مراد صورتِ معنوی لی جائے تو ضمیر کو آدم کی طرف راجع کرنے میں کسی تکلف کی حاجت نہ رہے گی اور لامحالہ اس کو حق تعالیٰ ہی کی طرف پھیرنا پڑے گا۔ اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جو زیادہ صریح ہے: "ان صورۃ الانسان علی صورۃ الرحمٰن" (دارقطنی فی الصفات عن ابی ہریرہؓ) اب حدیث خلق آدم علی صورتہ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور صورت سے مراد صورتِ عقلیہ معنویہ ہے نہ کہ صورتِ مادیہ جسمیہ۔

صورتِ عقلیہ کے اعتبارات ذات، صفات و افعال کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اب ذات پر غور کرو۔ اس سلسلہ میں امام غزالیؒ کی تحقیقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو (المضنون بہ علی غیر اھلہ) میں تفصیلاً اور کیمیائے سعادت وغیرہ میں اجمالاً موجود ہیں، روحِ انسانی کی ذات پر غور کرو کہ وہ کوئی جسمانی شے نہیں جو بدن میں اسی طرح داخل ہو گئی ہو جس طرح پانی برتن میں، اور نہ ہی اس کو عرض قرار دیا جا سکتا ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ قائم ہو جیسے سیاہی کسی سیاہ شے کے ساتھ قائم ہے، یا علم عالم کی ذات سے قائم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو متحیز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یعنی وہ کوئی جگہ نہیں گھیرتی کیونکہ جسم متحیز قابلِ تقسیم ہوتا ہے اور روح کسی طرح قابلِ تقسیم نہیں سمجھی جا سکتی۔

اسی طرح روح نہ انسان کے بدن میں داخل ہے اور نہ خارج اور نہ اس سے متصل ہے اور نہ منفصل۔ کیونکہ یہ سب باتیں ایسی چیز کے متعلق کہی جا سکتی ہیں جس کا جسم ہو اور وہ متحیز ہو اور روح میں ان میں سے کوئی بات نہیں۔

روح کو کسی "جہت" میں بھی نہیں مانا جا سکتا۔ اور نہ اس کو کسی جگہ میں حلول کئے ہوئے سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ صفتیں

بھی یا جسمانی شئے ہی کے متعلق صحیح ہو سکتی ہیں یا اعراض کے متعلق، اور روح نہ جسم ہے اور نہ عرض اس طرح روح بے چون و چگونہ بے کیف و نمونہ ہے اور یہ بعینہٖ ذاتِ حق تعالیٰ کے صفات ہیں۔ اسی طرح ذاتِ آدم ذاتِ الٰہی کے مشابہ ہوئی۔ فافہم وتدبر۔

اب صفاتِ روحِ انسانی پر غور کرو۔ یہ صفاتِ علم۔ ارادہ۔ قدرت۔ سمع و بصر و کلام ہیں۔ اور یہی صفات حق تعالیٰ کے بھی ہیں اس صورت میں بھی آدم کے صفات حق تعالیٰ کے صفات سے مشابہ ہوئے۔ فافہم وتدبر۔

آخر میں افعالِ روحِ انسانی پر غور کرو۔ امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت میں اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے فعل کا آغاز خواہش اور ارادہ سے ہوتا ہے۔ پہلے اس کا اثر قلب میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس کا اثر دماغ پر ہوتا ہے۔ اس سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں جن کا منبع دماغ ہے۔ پھر ان سے اوتاد اور رباطات متاثر ہوتے ہیں جو ہر جوڑ سے لگے ہوئے ہیں ان سے انگلیاں حرکت کرتی ہیں اور ان سے (مثلاً) قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ صورت جس کو انسان کاغذ پر لکھنا چاہتا ہے منصہ ظہور میں آتی ہے۔

افعالِ انسانی کی ان تفصیلات پر غور کرنے سے افعالِ الٰہی کی کیفیت بھی سمجھ میں آتی ہے جس طرح انسان کا تصرف اپنے بدن پر ہوتا ہے جس کو "عالمِ صغیر" سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح خالقِ اکبر کا تصرف "عالمِ کبیر" (کائنات) پر جاری ہے دیکھو ارادۂ انسانی کو قلبِ انسانی سے جو نسبت ہے وہی "امر" کو "عرش" سے سمجھی جا سکتی ہے، اور قلب کو دماغ سے جو نسبت ہے وہی "عرش" کو "کرسی" سے مانی جا سکتی ہے۔ حواسِ انسانی کو ذاتِ انسانی سے جو نسبت ہے وہی فرشتوں کو ذاتِ الٰہی سے قرار دی جا سکتی ہے۔ جس طرح حواسِ انسان کے مطیع و منقاد ہیں اسی طرح ملائکہ حق تعالیٰ کی اطاعت پر مجبور و مجبول ہیں۔[1]

اس مختصر توضیح سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ذات و صفات و افعالِ انسانی ذات و صفات و افعالِ الٰہی سے مشابہ ہیں۔ اور یہی مشابہت معنوی صورت حقیقی ہے جس کا "خلق آدم علیٰ صورتہ" میں ذکر آیا ہے۔ آدم مظہرِ ذات و جامع جمیع صفاتِ الٰہیہ ہے۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو "اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے"۔ یہ دو ہاتھ جلال و جمالِ الٰہی ہیں۔ یعنی انسان حق تعالیٰ کی ذات کا مظہرِ تام ہے اور جمیع صفاتِ الٰہیہ کا جامع ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ "خلق آدم علیٰ صورتہ ووجھہ" (طبرانی عن ابی ہریرہؓ) یعنی اس کی تخلیق صفاتِ اللہ و ذاتِ اللہ پر ہوئی ہے۔

اس سلسلہ میں اگر تم اللہ تعالیٰ کے اس قول پر کہ "سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق" (پ ۲۵-ع ۱۵) تعمق کی نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انفس کو آفاق پر عطف فرمایا ہے (حرف ف کے ساتھ) یعنی جو آیات یا صفات اللہ آفاق، کائناتِ خارجی میں ظاہر ہیں وہی آیات یا صفات نفسِ آدم میں بھی موجود ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ کائناتِ خارجی میں یہ من حیث التفرق ہیں اور نفسِ انسانی میں من حیث الجمع ہیں۔ اس لئے انسان جس کو عالمِ صغیر سے تعبیر کیا جاتا

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھو کیمیائے سعادت فارسی ص (۲۵) مطبوعہ نول کشور پریس۔

سے خلاصۂ عالم کبیر قرار دیا جاتا ہے۔ اس جامعیتِ صفات کے اعتبار سے انسان کو اپنی صورت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (ظہورِ صفات کی صورت کا نام آدم (یا انسان) رکھا گیا ہے۔

صورت دراصل نام ہے اس محل کا جس میں حقیقت مخفی و مستتر رہتی ہے۔ لیکن اپنا اظہار اس کے ذریعہ کرتی ہے۔ نور کی مثال سے اس اجمال کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ دیکھو نور ظہورِ الوان کی حقیقت ہے۔ کیونکہ نور کے بغیر ظہورِ الوان ممکن نہیں۔ الوان مظہرِ نور کا محل ہیں۔ بالفاظ دیگر نور ہی بصورتِ الوان ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن نور صورتِ الوان میں مخفی و مستتر رہتا ہے، اور باوجود ظہور کے باطنِ الوان کہلاتا ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نور ظہورِ الوان کی حقیقت ہے اور مختلف الوان کی یہ صورتیں عارض ہیں۔ ان عوارض کو صفاتِ نور قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا صفاتِ صورتِ نور صورتِ الوان کے ظہور سے حقیقتِ نور مستور ہوتی ہے۔

نور کی اس مثال سے ممکن ہے صاف طور پر ظاہر ہو جائے گا کہ کس طرح آدم کو حق تعالیٰ کا آئینۂ صورت قرار دیا جا سکتا ہے جو خود بے صورت ہیں۔ جل جلالہ و عظم شانہ۔

جز یکے نیست نقدِ ایں عالم — یا زمین دہ بعالمش مفروش
گلِ ایں باغ را توئی مغفہ — سرِ ایں گنج را توئی سرپوش
پردہ بردار تا بہ بینی خویش — دوست با دوست شد ہم آغوش
آں شناسد حدیثِ این لِ ست — ہر کہ ایں بادہ کردہ باشد نوش

لہٰذا عارفِ تام المعرفت اس صورت میں "صورت ہی" کا مشاہدہ کرتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

نہاں بصورتِ اغیار یار پیدا شد — عیاں بہ نقشِ دنگاراں نگار پیدا شد
پدید گشتہ ز کثرت جمالِ وحدتِ ذات — یکے بجلوتِ چندیں ہزار پیدا شد

نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہو جیو — ہر رنگ میں تم اس کو نمودار دیکھنا

عارف جانتا ہے کہ یہ صورت اس معنی مطلق ہی کی صورت ہے۔ یہ تشبیہ تنزیہ حق ہی کی تشبیہ ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ذات میں ذاتِ مطلق کا اپنے صفات میں صفاتِ حق کا اپنے افعال میں افعالِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور "فی انفسکم افلا تبصرون" کی تنبیہ سے پوری طرح فائدہ حاصل کرتا ہے۔ تاکہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ" کا پوری طرح صادق آئے۔

۱؎ اس قول کو ابن حجر مکی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول قرار دیا ہے لیکن دیلمیؒ نے اس کو حدیث قرار دیا ہے اور غزالیؒ اور محی الدین ابن عربیؒ نے بھی اس کا حدیث ہونا مانا ہے۔ اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ماوردی نے حضرت عائشہؓ سے اس طرح بیان کیا ہے۔ "اذا قالت یا رسول اللہ من یعرف الانسان ربہ؟ قال اذا عرف نفسہ" مولانا عبدالرحمٰن صوفیؒ فرماتے ہیں کہ گو لفظاً اس کے حدیث ہونے میں اختلاف ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

بہرحال اس طویل مقالہ سے کسی کو یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم عینیتِ محضہ کی تعلیم پیش کر رہے ہیں اور حلول واتحاد کے قائل ہیں۔ ہم قطعاً اس کے قائل ہیں کہ "حق ظاہر بصورتِ حقیقی اشیاء ۔ اشیاء موجود دبوجود حقیقی حق" لیکن مظہر کے مظاہر میں ظہور پذیر ہونے کی وجہ سے مظہر میں تغیر وتبدل، تجزی وتقسیم، حلول واتحاد نہیں ہوتا۔ ظاہر ومظہر، رب وعبد، حق خلق ہیں جو نسبت ظہور ہے اس کا حکم دوسری تمام نسبتوں سے مختلف ہے۔ چونکہ ظاہر تمام اعتبارات سے مظہر کا عین نہیں اور نہ جمیع اعتبارات سے اس کا غیر "لاعین ولاغیر" نہ صرف عینیتِ محضہ اور نہ صرف غیریتِ محض۔ اس کی تفصیل وتشریح کے لئے قرآن وتصوف کے باب سوم وچہارم کا مطالعہ ضروری ہے۔

سارے مقالہ کا خلاصہ ابوالوفا خوارزمی کے ان اشعار میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ فافہم وتدبر۔

من از تو جدا نبودہ ام تا بودم — ایں است دلیلِ طالعِ مسعودم
در ذاتِ تو ناپدید اگر معدوم — در نورِ تو ظاہرم اگر موجودم

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

طلوعِ اسلام:- ان "آفاقی حقائق" کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی!

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہو سکتا ہے لیکن منشائے اصل الاصول طریقت ہے۔ اور کتاب وسنت کے موافق ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وفی انفسکم افلا تبصرون" (پ ۲۶ ع ۸) ونیز حدیث قدسی" یا آدم اعرف نفسک تعرف ربک" بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ گو مولانا نے اس حدیث موقوف کی سند نہیں بیان فرمائی۔ لیکن غور وتدبر سے کام لینے والوں کے لئے "وفی انفسکم افلا تبصرون" ہی کافی اشارہ بلکہ ہے اور اگر اس سلسلہ میں "سنریہم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق" کے ارشاد باری پر غور کیا جائے تو جیسا کہ اوپر متن میں بتلایا گیا ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیات وصفات الٰہیہ جو فی الانفس ظاہر ہیں وہ حق کے مظاہر ہیں اور ہر نفس مظہر اسماء وصفاتِ حق ہے۔ لہٰذا معرفتِ نفس معرفتِ حق کی کنجی ہے۔ فافہم وتدبر۔

طلوعِ اسلام کے پُرانے فائل

طلوعِ اسلام کے مندرجہ ذیل پرانے فائل جن صاحب کو ضرورت ہو تحریر کریں۔

سنہ ۱۹۵۲ء۔ سنہ ۱۹۵۳ء۔ سنہ ۱۹۵۶ء۔ سنہ ۱۹۵۸ء۔ سنہ ۱۹۵۷ء۔ سنہ ۱۹۵۳ء۔ سنہ ۱۹۵۵ء (ہفتہ وار طلوعِ اسلام)

ظریف بیگ۔ ۱۹۔ ایشور اسٹریٹ۔ کرشن نگر۔ لاہور